سیرت

حضرت ابوذر غفاری

(رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اسلامی مساوات کے نقیب و علمبردار

صحابیٔ رسول کے حالات و خیالات

سیرت نگار

آغا اشرف

نام کتاب ــــــ حضرت ابوذر غفاری (رضی اللہ عنہ)
مصنف ــــــ آغا اشرف
صفحات ــــــ ۲۵۶
تعداد ــــــ ۱۰۰۰ (ایک ہزار)
اشاعت اوّل ــــــ اگست ۱۹۹۱ء
سائز ــــــ ۱۸×۲۳/۸
مطبع ــــــ تعمیرِ ادب پریس، بابا فرید روڈ لاہور
ناشر ــــــ قاضی پبلیکیشنز ۱۲۱ ذوالقرنین چیمبرز لاہور
قیمت ــــــ ۶۰ روپے
کتابت ــــــ محمد ریاض۔ ادارہ پروین کتابت لاہور

ناشر

قاضی پبلیکیشنز۔۱۲۱۔ذوالقرنین چیمبرز گنپت روڈ

انارکلی۔ لاہور

اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَی اللّٰہِ
وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا
وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (النور:۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جائیں
اللہ اور اُس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے درمیان
فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی، ایسے
ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

مَا اَظَلَّتِ الْخَضْرَآءُ وَلَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَاءُ عَلٰی
ذِی لَهْجَةٍ اَصْدَقُ مِنْ اَبِی ذَر ۔

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)

کسی زبان والے پر آسمان نے اپنا سایہ نہ ڈالا اور نہ زمین
نے اس کا بوجھ اُٹھایا جو ابوذر سے بھی زیادہ سچّا ہو۔

تدوین و ترتیب

آغازیہ

مدت سے اسلامی مساوات کے نقیب و علمبردار حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی سیرت و سوانح مرتب کرنے کی خواہش دل میں موجزن تھی جو اپنی نوعیت کی بیمثال اور لاجواب سیرت ہو۔ سیرت نگاری کے سلسلے میں ایک حسین و جمیل اضافہ ہو۔ مگر یہ بڑا بھاری اور محنت طلب کام تھا کیونکہ اس جلیل القدر صحابئ رسول سے متعلق جو معلومات و مواد موجود تھا نہایت ہی محدود و مختصر تھا اور غیر مستند بھی۔ لہٰذا اس کام کا بیڑا اُٹھانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مگر آتشِ شوق تھی کہ ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور اس صورت مین تو یہ اور بھی تیز تر ہو گئی جبکہ ایک دن میرے کرم فرما جناب پروفیسر اکرام صدیقی مدظلہ العالی نے میری توجہ سیرت ابوذر غفاریؓ مرتب کرنے کی طرف مبذول کرائی۔ میں ان کے نیاز حاصل کرنے گیا تھا، صاحب موصوف نے ایک حکم صادر کر دیا۔ فرمایا۔

"آغا صاحب! میری دلی خواہش ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے حالات و خیالات پر اردو و انگریزی میں کتاب شائع کروں لیکن اس کتاب میں یہ بات مدنظر رہے گی کہ مستشرقین نے جناب ابوذرؓ کے بارے میں متعدد کتابیں لکھی ہیں جو کہ اس اعتبار سے صحیح نہیں کہ مستشرقین نے اپنے نقطہ نظر سے اور اسلام و شعائر اسلام سے لاعلمی کی فضا میں لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے اس اعتبار سے صحیح نہیں کہ انہوں نے اس جلیل القدر

صحابی رسول کی عظمت کی تائید میں جو کچھ لکھا ہے تکذیب ہو کے رہ گیا ہے
ان کی تحریریں حضرت ابوذرؓ کی شخصیت کو (Dignify) نہیں کرتیں بلکہ
(Disfigure) اور (Defocus) کرتی ہیں۔ کوئی ایسی کتاب لکھیں جو
اس کا ازالہ کرے اور میرے نزدیک آپ اس کام کے لیے موزوں ترین ہیں۔"

میں نے عرض کیا۔
"یا حضرت! یہی خواہش خاکسار کے سینے میں مدت سے مچل رہی ہے لیکن
اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکنے کی ایک وجہ تو میرا تساہل و غفلت اور دوسری
وجہ اس موضوع پر کار آمد معلومات و مواد کی کمیابی بلکہ نایابی ہے۔"

اس سلسلے میں صدیقی صاحب نے ایک کتاب منگوا کر دی جس کے مطالعے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مذکورہ کتاب ایک مستشرق کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے خارزار کے سوا کچھ نہیں جس میں قدم رکھنا خود زخمی ہونا اور دوسروں کو زخمی کرنا ہے۔ ویسے بھی یہ کتاب اس پیٹرن سے بالکل مختلف تھی جو میرے ذہن میں اس سے متعلق موجود تھا۔

میں نے متعدد لائبریریوں سے رجوع کیا۔ فقط پنجاب پبلک لائبریری میں اس موضوع پر انگریزی میں ایک کتاب ملی جو یہی کتاب تھی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ حیرت ہوئی کہ اتنی بڑی لائبریری میں اس موضوع پر اس کے علاوہ اور کوئی کتاب ہی انگریزی میں موجود نہیں۔ البتہ اردو میں متعدد کتابیں نظر سے گزریں لیکن معلومات مواد کی حد تک میں ان سے بھی کچھ استفادہ نہ کر سکا۔

بہر حال صدیقی صاحب کے پیہم اصرار اور اپنی دیرینہ خواہش کے مسلسل کچوکوں سے میں نے کمر ہمت باندھی اور سنین و تواریخ کی روشنی میں اسلام کی اس بڑی دھار دار شخصیت کی سیرت کی تالیف و تصنیف پر کام شروع کر ہی دیا اور یہاں تک جان ماری کہ سخت علالت میں بھی اس کام سے منہ نہ موڑا۔ جس کا ماحصل پیش نظر کتاب ہے۔ جس کے اوراق میں ایک ایسی ہستی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی نظر آتی ہے جس کی ساری انتہائی سرگرم تحریکی زندگی حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے

نظامِ حیات کو نافذ کرنے کی جدوجہد میں گزری۔ جس کے متعلق خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا :

کسی زبان والے پر آسمان نے اپنا سایہ نہ ڈالا اور نہ زمین نے اس کا بوجھ اٹھایا جو ابوذر سے بھی زیادہ سچّا ہو۔

○

ولادت اور ابتدائی حالاتِ زندگی

پُر ہول چٹانوں اور لق و دق ریگستانی بیابانوں میں سے ہوتی ہوئی جو کاروانی شاہراہ مکہ مکرمہ سے شام و فلسطین کو جاتی ہے، اسی پر بحوالہ حافظ ابنِ حجر اور محمد الواقدی مشہور معرکۂ کارزار بدر کے مقام پر ایک قبیلہ بنو غفار آباد تھا۔ جس کا مورث اعلیٰ غفار بن ملیل تھا جو کنانی النسل عرب تھا۔ اس قبیلہ بنو غفار کے لوگ راہزن تھے اور شاہراہ شام و فلسطین پر آتے جاتے قافلوں اور کاروانوں کو لوٹا کرتے تھے۔

اسی قبیلہ کے ایک فرد جنادہ بن کعب بن سفیان بن حرام بن غفار کے گھر ایک غفاریہ خاتون رملہ بنت ربیعہ کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام والدین نے جندب رکھا اور اسی نام کی وہ پیاری تفسیر ہے جسے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے "یا جنیدب" کے مشفقانہ خطاب میں استعمال فرمایا۔

ابوذر آپ کی کنیت ہے اور عام طور سے آپ اسی کنیت سے معروف ہوئے اور اخیر میں شیخ الامۃ کے لقب سے آج تک ملقب ہیں اور جب تک جہانِ سنگ و خشت قائم ہے اسی لقب سے ملقب رہیں گے۔

انسان جس قوم میں پیدا ہوتا ہے اس کی عادات و اطوار کا حامل ہوتا ہے۔ ابوذرؓ جوان ہوئے تو قومی پیشہ رہزنی اختیار کیا۔ فطرتاً بڑے جری و شجاع تھے تنِ تنہا راتوں کو قبیلوں پر جا پڑتے۔ عرب کے بہادر و دلیر گلہ بانوں کو للکار کر تہ تیغ کرتے ہوئے ان کے اونٹوں اور مویشیوں کے ریوڑ ہانک کر اکیلے اپنے قبیلے میں لے آتے کبھی خیال گزرتا تو گھوڑے پر سوار بغیر کسی ساتھی کے مال و دولت سے لدے کاروانوں اور

قافلوں پر شاہین کی طرح جھپٹتے اور خون ریزی کرتے ہوئے ان کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ لیتے۔

مورخین کہتے ہیں کہ ان کا حملہ پیادہ پا ہوتا تو عجیب چستی و چالاکی سے قافلوں میں جا گھستے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ایک بپھرا ہوا شیر بھیڑ بکریوں کے گلے پر جا پڑا ہے۔ آپ کی اسی قزاقانہ مساعی اور جیالے پن کی وجہ سے قوم کے صنادید آپ پر فخر کرتے تھے۔ آپ کو ضیغم بنو غفار کہتے تھے۔

اے۔ جے۔ کیمرون اپنی تالیف "ابوذر الغفاری رض" میں ابوذر رض کی دلیری و شجاعت اور طاقت کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

Abu Dharr was an upright, valiant man, who barred the way of troops of Camelry attacking them at break of day, sometimes mounted at others on foot. At night he raided the tribes and seized whatsoever his hand found.
As a lone marauder who fell upon Caravans and unaided like some wild beast one may perhaps detect the tendency to depict him as a mighty man of valour after the order of samson or rather Ali.

ابوذر رض نے ان گنت قافلے لوٹے۔ بے شمار مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا اور پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کے ایک بڑے ہی دردناک واقعہ نے ابوذر رض کی کایا کلپ کر دی۔ اندھیرا چاہے کتنا ہی گھنا ہوا اُجالے کی بس ایک کرن اس کو اجال دیتی ہے۔

ہوا یوں کہ ابوذر رض نے شام و فلسطین سے آنے والے ایک قافلے پر حملہ کیا۔ بڑی غارت گری کی۔ بہت سے مردوں، عورتوں اور بچوں کو نہایت بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا تو قتل ہوتی ہوئی عورتوں اور بچوں کی دردناک چیخوں نے قیامت کا سماں باندھ دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ چیخنے اور کراہنے والوں کے ساتھ ریگستانی

بیابان کا ذرّہ ذرّہ غول بیابانی بن کر چیخ چنگھاڑ رہا ہے۔

ابوذرؓ اس دردناک منظر سے بڑے متاثر ہوئے۔ آپ پر اصلی فطرت غالب آگئی اور قبائلی بُرے اثرات جو طبعی نہ تھے زائل ہو گئے۔ آپ کو اپنی ظالمانہ حرکتوں پر سخت ندامت ہوئی۔ اُس دن سے آپ نے راہزنی سے توبہ کر لی۔

جاہلی عرب مشرک ضرور تھے کہ دیویوں اور دیوتاؤں کو پوجتے تھے لیکن قرآن وحدیث کے آثار و اشعار کے تتبع سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو انہوں نے سرے سے بھلا نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے تمام معبودوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑا، بہت زیادہ ندرت و قدرت والا مانتے تھے۔ اپنے اہم دنیوی و اُخروی معاملات میں اسی سے رجوع کرتے تھے۔ بتوں کو انہوں نے محض سفارت و شفاعت کا درجہ دے رکھا تھا۔

اسی بنا پر حضرت ابوذر غفاریؓ پر اپنی عاقبت کی بدانجامی کا خوف روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا گیا تو انہوں نے بُتوں کے آگے گڑگڑانے کے بجائے دل سے ہی فیصلہ کیا کہ اپنی خونریزیوں اور مخلوقِ خُدا پر توڑے ہوئے مظالم کے کفارہ میں اپنی عمر کا باقی حصہ خدا کی عبادت میں گزار دیں کہ ممکن ہے یہی عبادت گذشتہ معصیتوں اور غارت گری کا کفارہ ہو جائے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہونے سے تین سال پہلے سے نمازیں پڑھتا تھا۔"

(طبقات ابن سعد۔ صحیح مسلم)

راوی نے پوچھا۔

"آپ کس طرح نماز پڑھتے تھے؟"

فرمایا۔

"لِلّٰہ، خدا کے لیے۔"

راوی نے پوچھا۔

"کس رُخ نماز پڑھتے تھے؟"

فرمایا۔

"حیث یوجھنی اللہ۔ جدھر اللہ تعالیٰ جھکا دیتے۔"

خشیت کا یہ عالم تھا کہ رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو بس کھڑے ہی رہتے یہاں تک کہ پچھلی رات بھی ختم ہونے کے قریب ہوتی تو اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیتے اور اس طرح پڑے رہتے گویا کوئی کپڑا پڑا ہوا ہے۔ اسی حالت میں پڑے سورج نکل آتا اور آپ پر دھوپ پڑنے لگتی۔

انہی ایام میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط کے آثار رونما ہوئے۔ ہریالی کا کہیں نشان نظر نہ آتا تھا۔ قبیلہ غفار کے اناج کے ذخیرے ختم ہو گئے۔ جانور دُبلے ہونے لگے ایسی تشویشناک صورت حال میں قبیلے کے سردار مشورے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ ان کا معبود منات اُن سے ناراض ہو گیا ہے۔

اپنے معبود منات کو خوش کرنے کے لیے انہوں نے اونٹوں کی قربانی دی۔ گڑگڑا کر دعائیں مانگیں مگر بارش نہ ہوئی تو قبیلہ غفار کے سرداروں نے یہ فیصلہ کیا کہ قبیلے کے سب لوگ روتے پیٹتے حج کے لیے نکلیں اور چل کر منات دیوتا سے معافی مانگیں شاید وہ معاف کر دے اور بارش ہو جائے۔

پورا قبیلہ تیاری کر کے اونٹوں پر سوار قدید کی جانب چل پڑا۔ جہاں منات کا بُت نصب تھا۔ اس قافلے میں ابوذر غفاریؓ کے بھائی انیس بھی شامل تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو انہوں نے اپنے بھائی ابوذرؓ کو نہ پایا۔ وہیں سے اونٹ کو موڑا، واپس گھر آئے، دیکھا تو ابوذرؓ لیٹے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔

"بڑے مزے سے لیٹے ہوتے ہو۔ کیا تمہارے کانوں میں منادی کی آواز نہیں پڑی کہ سفر پر نکلو۔ قوم منات کے حج کو جا رہی ہے اور تم آنکھیں موندے یہاں پڑے ہو۔"

ابوذرؓ نے جواب دیا۔

"انیس بھیا آپ جائیں۔ میں منات کے حج کے لیے جانا نہیں چاہتا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ توبہ کرو۔ منات تم پر عذاب نازل نہ کردے۔"
ابوذرؓ بولے۔
"بت پتھر کا ہو یا پیتل کا، بُت ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ـــــ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ ایک بے جان چیز ہے۔ نہ سُنتا ہے، نہ دیکھتا ہے۔"
انیس بولے۔
"غضب کرتے ہو اپنے معبود کو بُرا کہتے ہو۔ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تجھے کسی آسیب نے تو نہیں دبوچ لیا ہے۔ اب اپنے منہ سے ایسی ویسی کوئی بات مت نکالنا۔ جلدی اُٹھ جاؤ۔ قوم کا قافلہ کافی دُور نکل چکا ہے۔"
انیس نے اس قدر اصرار کیا کہ اپنے بھائی کو اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ دونوں بھائی اونٹ پر سوار ہو گئے۔ انیس نے اپنے بھائی کو ہدایت کی۔
"خبردار جو تم نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ورنہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ منات کی ناراضی کا سبب تم ہی ہو۔ بارش تمہاری وجہ ہی سے نہیں ہو رہی ساری قوم تمہارے خلاف ہو جائے گی تمہیں جینے نہ دے گی۔"
اور اس کے ساتھ ہی انیس نے منات کے فضائل و مناقب بیان کرنے شروع کر دیئے۔ ابوذرؓ بے رغبتی سے سنتے رہے۔ وہ کسی اور ہی خیال میں منہمک و مستغرق تھے۔ سفر کے مرحلے طے ہوتے چلے گئے۔ قبیلہ غفار کا قافلہ ہیکل منات میں پہنچا۔ لوگ اونٹوں سے اُترے۔ منات کا طواف کرنے لگے۔ روئے، گڑگڑائے، قربانیاں دیں۔ چاروں طرف خُون کے دھارے بہنے لگے۔ جیسے منات پسند کرتا تھا۔
ابوذرؓ خاموش تھے اور یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اپنی قوم کی حماقت و جہالت پر افسوس کر رہے تھے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ منات ایک پتھر ہی تو ہے جو نہ ہدایت دے سکتا ہے نہ گمراہ کر سکتا ہے۔
رات ہو گئی۔ قوم نے اپنے اردگرد آگ کا الاؤ روشن کیا۔ جس کے آس پاس قصہ گو اور داستان گو بیٹھ گئے۔ ابوذرؓ ایک ایسے حلقے کی طرف گئے جہاں قبیلے کے معمر لوگ جمع

تھے۔معبودوں اور ان کی عظمتوں کے تذکرے ہو رہے تھے۔ کوئی منات کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ کوئی فلس کی مدح سرائی میں محو تھا۔ کوئی لات و عزیٰ خدا کی بیٹیوں کی عظمت و شفاعت کا تذکرہ چھیڑے ہوئے تھا۔

دورِ جاہلیت میں اہلِ عرب تقریباً تمام ہی بت پرست تھے۔ اصنام پرستی عرب میں اس وقت اپنے پورے عروج پر تھی۔ اصنام پرستوں نے پتھر کے خداؤں کے حسب نامے مرتب کئے ہوئے تھے۔ بُت پرستی اہلِ عرب کا دین بن گئی تھی۔ ان کے مزاج میں داخل ہو گئی تھی۔ چونکہ عرب الگ الگ قبیلوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جنگ و جدال اور عداوت اُن کے خمیر میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ طبعاً آزاد اور غیر محکوم طرزِ زندگی کے عادی تھے۔ اس لیے توحید، قانون کی پابندی، حاکمیت و محکومیت، شہریت و مدنیت، حکومت و سلطنت کے حقوق و فرائض اُن کے مزاج کے یکسر خلاف تھے۔ اُن کی جاہلیت اور غیر مدنی زندگی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ توحید اور دین کی تلقین و پابندی سے دُور رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ عرب جس طرح قبیلے قبیلے اور کنبے کنبے میں بٹے ہوئے تھے، اسی طرح اُن کے اصنام اور خُدا الگ الگ تھے اور جس طرح وہ کسی ایک طریقہ و اصول کے پابند نہ تھے اسی طرح بدویت ان کا مزاج بن گئی تھی۔ اسی طرح وہ بتوں کی عظمت و بڑائی کے قائل تھے یعنی کسی بت کو کم اور کسی کو بہت زیادہ پوجتے تھے، اسے پتھر کے خداؤں کا خُدا سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مختلف بُتوں کی پرستش کے باوجود اُن کو چھوڑ بھی دیتے تھے۔

آج تک کوئی مورخ، کوئی محقق یہ نہیں بتا سکا کہ عربوں کی بت پرستی کب شروع ہوئی۔ یہاں تک معلومات اور تحقیق کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا ہے۔ یہی نشان ملتا ہے کہ عرب بُت پرست تھے۔ اصنام پرستی کے تفصیلی جائزے سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ عرب کا کوئی حصہ اور کوئی گوشہ بُت پرستی سے خالی نہ تھا۔ تاریخ میں جس قدر مقامات قبیلے اور خاندان ملتے ہیں سب میں بُت پرستی کا نشان ملتا ہے۔ عرب کے حالات لکھنے والے مسلمان مؤرخین نے ان روایتوں کا بالاتفاق ذکر کیا ہے کہ عرب کسی زمانے میں موحد اور خدا پرست تھے۔ دین ابراہیمی پر قائم تھے۔ پھر ان میں بُت پرستی پھیلی اور خانہ کعبہ میں

بُت پرستی جاری ہو گئی۔

ابن کلبی نے لکھا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل مکہ میں بہت ہو گئی تو مکہ کی زمین اُن کے لیے تنگ ہو گئی۔ لوگ مکہ سے باہر تلاش معاش میں نکلنے لگے۔ وہ اپنے ساتھ کعبہ سے پتھر اُٹھا کر لے جاتے۔ اسے بابرکت سمجھتے ہوئے اس کی تعظیم و تکریم کرتے۔ کعبہ کی طرح اس کا طواف کرتے اور جب واپس آتے تو اس پتھر کو پھر سے کعبہ میں رکھ دیتے اور اس کی تعظیم جاری رہتی۔

اس قسم کی جتنی روایتیں بت پرستی کی اشاعت کے لیے مشہور تھیں۔ ابن کلبی نے سب کو یکجا کر دیا ہے۔ ان تمام روایتوں میں عمر بن لحی کی حکایت راویوں میں بہت مقبول و مشہور ہے۔ سب نے کچھ اختلاف کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ عمر بن لحی بیرون عرب شام یا مصر سے اصنام لایا اور اہلِ مکہ اور اہلِ عرب میں بت پرستی جاری کی اور بعض نے ہذیل بن مدرکہ کو بت پرستی کا بانی قرار دیا ہے۔

ایک روایت یہ ہے کہ عمر بن لحی کی بت پرستی کی دعوت کو عوف بن عزرہ نے سب سے پہلے قبول کیا۔ لہٰذا عمر نے عوف کو وَدّ دیوتا کا صنم دے دیا۔ وہ اسے وادی مکہ میں لے گیا اور دومۃ الجندل میں نصب کر دیا۔ عوف نے اپنے بیٹے کا نام عبدِوَد رکھا۔ یہ سب سے پہلا نام ہے جو اس بُت کے نام پر رکھا گیا۔ پھر عرب میں دوسروں کے نام بھی اس بُت کے نام پر رکھے گئے۔

اس روایت میں عوف کے دادا کا نام زید اللات ہے۔ اس نام سے لات کی پرستش کا بہت پہلے سے وجود ملتا ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ وَدّ بعد میں باہر سے لایا گیا۔ ایک روایت میں عمر بن لحی کو عربوں میں اصنام پرستی کو رائج کرنے والا قرار دیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ کھانا کھلاتا تھا۔ کپڑے تقسیم کرتا تھا۔ لات کی بُت نما چٹان پر ستو گھول کر ملتا تھا۔ اس قسم کی تمام روائتیں جو اساطیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں مجموعی طور سے بتوں کی درآمد کی تائید و توثیق تو کرتی ہیں لیکن وقت اور زمانے کا تعین نہیں کرتیں۔

ابتدا میں عرب قبیلے ایک قدیم کُل کو مانتے تھے۔ یہ حقیقت میں اُن کا خدا تھا۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اس کے شریک بھی بنا لیے۔ جسے اہلِ علم توحیدِ قدیم کہتے ہیں۔ آسمانی کتابوں میں بھی اس نظریہ کی تائید ہے۔ عرب ان بتوں کو وسیلہ مانتے تھے اور کہتے تھے یہ ہماری سُنتے ہیں۔ ہماری گواہی دیتے ہیں۔ وہ بتوں کی قسم کھاتے تھے ان کے سامنے حلف اٹھاتے تھے۔ ان کی عبادت کرتے تھے۔ انہیں ہدیے پیش کرتے تھے۔ عرب میں ہر قبیلہ کا اللہ مخصوص تھا۔ جیسے ربّ قریش، ربّ ربیعہ، ربّ اوس، خدائے خزرج وغیرہ۔ ان کے نام پر جانور آزاد کیے جاتے۔ جانور قربان کیے جاتے۔ جب کوئی جانور بوڑھا ہو جاتا تو اُس کو بُت کے نام پر چھوڑ دیتے۔ چنانچہ بُت کے نام پر چھوڑے ہوئے بوڑھے اونٹ کو حام اور بُت کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی کو بحیرہ کہتے تھے۔

ان بُت پرستوں کی کوئی مذہبی شریعت یا احکامات نہ تھے جو فرد کو معاشرے سے وابستہ کرتے ہوں یا فرد پر کچھ فرائض و حقوق عائد کرتے ہوں بلکہ افراد بتوں کو اپنی ضرورت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان عربوں کے دلوں میں بتوں کی عزت بھی کچھ زیادہ نہ تھی بلکہ ان کا مذاق بھی اُڑاتے تھے اور ان کی عظمت کا انکار بھی کر دیتے تھے۔

دورِ جاہلیت کے نامور شاعر امراء القیس کے باپ کو کسی نے ہلاک کر دیا۔ وہ اس کا انتقام لینے کے لیے روانہ ہوا۔ ذوالخلصہ کے مندر میں ٹھہرا کہ صنم ازلام سے فال نکلوائے۔ تینوں دفعہ فال نکلی کہ ارادہ چھوڑ دو تو اس نے ٹوٹے ہوئے تیر بُت پر کھینچ مارے اور چلا آیا۔

"ملعون! اگر تیرا باپ مارا گیا ہوتا تو پھر مجھے تو انتقام لینے سے ہرگز منع نہ کرتا۔"

بُت پتھر، لکڑی، چاندی یا پیتل سے تیار کیے جاتے تھے۔ صنم کا لفظ اس بُت کے لیے استعمال کیا جاتا جس کا جسم اور مورتی ہوتی۔ اگر جسم یا صورت نہ ہوتی تو اسے عرب وثن کہتے تھے۔ مسلمان مورخین نے عرب کے قدیم بتوں اور بیرونِ عرب

سے آتے ہوئے بتوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ بہت سے سامی قبائل کے بُت آئے اور بہت سے دوسرے دُور دراز قبائل کے بت کسی طرح پہنچ گئے اور عرب میں ان سب کی پرستش ہوتی رہی۔ اُس وقت ہر طرف دنیا میں بُت پرستی جاری تھی۔

قرآن شریف میں جن اصنام کا ذکر ہے اُن میں ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر بھی ہیں۔ سواع موضع رباط میں تھا اور قبیلہ ہذیل کا بت تھا۔ یہ ایک پتھر تھا۔ ایک روایت میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ سواع ہمدان کے بتوں میں سے ایک بُت تھا اور عورت کی شکل کا تھا۔ سواع کے لیے یہ بھی روایت ہے کہ سواع حضرت شیث کے بیٹے کا نام تھا اور یغوث سواع کے بیٹے کا نام اور اسی طرح یعوق اور نسر ہیں۔ جب یہ مر گئے تو ان کی صورتیں بنائی گئیں اور پھر ان بتوں کی پرستش ہونے لگی۔

یغوث کا بُت موضع منج اور یمن میں تھا۔ اہلِ جرش اس کی پرستش کرتے تھے۔ اور ایک روایت کے مطابق بنو غطیف اس کے پرستار تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ بُت طے قبیلے کے ایک خاندان میں تھا اور جس دن جنگِ بدر ہوئی تھی اسی روز دو قبیلوں میں یغوث کے سلسلہ میں جنگ ہوئی تھی۔

اہل جاہلیت میں اس بُت کے نام کے اشخاص ملتے ہیں۔ عبد یغوث قریش میں بھی تھا۔ عبد یغوث دُرید بن صمۃ شاعر کے بھائی کا نام بھی تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس بُت کی پوجا ہوازن، قریش، مذحج اور تغلب قبیلوں میں ہوتی تھی اور شمال مشرقی جزیرہ عرب میں بھی اس کی پرستش رائج تھی۔

یعوق کا بت موضع رحب میں تھا۔ یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ یہ بت خیوان میں تھا۔ یہ جگہ صنعاء کے متصل ہے جو مکہ سے دو دن کی راہ پر ہے۔

نسر نامی بُت حمیر میں تھا اور ملک سباء کے ضلع بلخ میں بھی اس کی پوجا ہوتی تھی۔ حمیری لوگ ذی نواس کے زمانے تک اس کی عبادت کرتے رہے۔ پھر وہ یہودی ہو گئے۔ بنی ارم کا صنم بھی نسر تھا جو اہلِ عرب کے نسر کی طرح تھا۔ بہت سے قبائل اس کی پوجا کرتے تھے۔ خاص کر عرب والے اس بُت کی شکل گدھ جیسی تھی۔ حجاز میں

چٹانوں پر اس کی شکل کھدی ہوئی پائی گئی۔ طبری کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس نے الواقدی کے حوالے سے بتوں کی شکلیں بیان کی ہیں۔

کہا گیا ہے کہ ود کا بُت آدمی کی شکل کا تھا۔ سواع عورت کی شکل کا۔ یغوث شیر کی شکل کا۔ یعوق گھوڑے کی شکل کا اور نسر گدھ کی شکل کا۔ عمیانس قبیلہ خولان کا بُت تھا۔ ہر سال چوپاؤں اور کھیتی باڑی میں سے اس کا حصہ نکالا جاتا تھا۔ ادوم قبیلہ بھی اس کی پرستش کرتا تھا۔

مناۃ (منات) اہل تاریخ کی نظر میں سب سے قدیم صنم تھا۔ سمندر کے کنارے قدید میں مکہ اور مدینہ کے درمیان میں تھا۔ بعض کی رائے ہے کہ یہ ایک چٹان تھی۔ اس کی شکل عورت پر تھی۔ اوس اور خزرج قبیلے اس کی پرستش کرتے تھے۔ اہلِ مدینہ میں اس کے پرستاروں کی کثرت تھی۔ یہ لوگ حج کرتے وقت سر نہیں منڈواتے تھے بلکہ واپس آکر منات کے پاس اپنا سر منڈواتے تھے اور پھر اپنا حج مکمل سمجھتے تھے۔ عرب کے دوسرے قبائل بھی اس کی بڑی تعظیم کرتے تھے مثلاً قریش، ہذیل اور خزاعہ وغیرہ جو اس بُت کی بھینٹ میں جانور بھی ذبح کرتے تھے۔ اس پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ یہ ان کا موت وحیات کا معبود تھا۔ ۸ھ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اس کو ڈھانے کے لیے بھیجا۔ اسے ڈھانے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس بت پر رکھی ہوئی دو تلواریں لائے۔ ایک کا نام مخذوم اور دوسری کا رسوب نام تھا۔ بقول طبری و واقدی یہ دونوں تلواریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دے دیں۔

اللات بھی عرب کا مشہور صنم تھا۔ شمالی عرب میں خصوصیت سے اس کی عبادت ہوتی تھی۔ پتھر کے نقوش میں "اللت" اس کا نام لکھا تھا۔ اس بُت کے معبد مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے تھے۔ جب اسلام آیا اس وقت اس کا مشہور معبد طائف میں تھا اور قبیلہ ثقیف کا مسجود تھا۔ یہ ایک مربع سفید چٹان تھی۔ قبیلہ ثقیف نے اس کے اوپر عمارت بنا دی تھی۔ کعبہ کی طرح اس کو غلاف پہناتے تھے۔ اس کی

وادی کی حرمت کرتے تھے۔ اہل قریش اور تمام عرب اس کی عظمت کے گیت گاتے تھے۔
اہل ثقیف سفر سے آتے تو پہلے لات کے پاس آتے پھر گھر جاتے۔ اسے بیت الربّہ
بھی کہتے تھے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے یہ مؤنث صنم تھا۔ العزیٰ بھی لات کی طرح
مؤنث صنم تھا اور مقام نخلہ میں تھا۔ لہٰذا لوگ جب حج سے فارغ ہوتے اور کعبہ کا طواف
کر لیتے تو بھی احرام نہیں اتارتے تھے اور ایک دن اس کے قریب ٹھہرتے قریش العزیٰ
کی عبادت کرتے تھے۔ اس کی زیارت کرتے تھے۔ اس پر تحفے چڑھاتے تھے۔ اس پر
جانور ذبح کرتے تھے۔ العزیٰ کو ڈھانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد
بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ انہوں نے اسے ڈھایا۔ اس کے صحن میں تین درخت تھے۔
سریانی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ عزّیٰ پر انسانی قربانی کی جاتی تھی۔ بعض قبائل اس بُت
پر اپنی اولاد کی قربانی بھی کرتے تھے۔

ہبل کعبہ کا سب سے بڑا بُت تھا۔ یہ کعبے کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے
سات تیر رکھے رہتے تھے۔ پہلے تیر پر لکھا تھا "صریح" اور آخر پر لکھا تھا عصق۔ اگر
کسی نومولود کے متعلق شک ہوتا تو ہبل پر نظر چڑھاتے اور تیر پھینکتے۔ اگر "صریح" نکلتا
تو اسے خاندان میں شامل کر لیتے اور اگر "عصق" نکلتا تو اسے دے دیتے اسی طرح
میت کا تیر تھا، نکاح کا تیر تھا، سفر کا تیر تھا، دشمنی کا تیر تھا۔ جب کوئی اہم بات پیش
آتی تو ہبل کے پاس آتے اور پانسے پھینکتے اور جیسا نکلتا اس پر عمل کرتے۔

ہبل سُرخ عقیق کا بنا ہوا انسانی مجسمہ تھا۔ دایاں ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا چنانچہ قریش
نے اس کا ہاتھ سونے کا بنا دیا تھا۔ اس کے نام پر ایک خزانہ وقف تھا۔ اس پر سو
اونٹ قربان کیے جاتے تھے۔ اس کی خدمت کے لیے خادم تھے۔ ہبل تمام بنی کنانہ اور
قریش کا بت تھا۔ اسے عراق سے لائے تھے۔ جنگِ اُحد میں ابوسفیان نے ہبل ہی کا
نعرہ لگایا تھا۔

"اُعل ہبل"

اساف و نائلہ دو بت تھے۔ ایک مرد کا ایک عورت کا۔ انہوں نے کعبہ میں

فعل شنیع کیا تھا۔ دونوں مسخ ہو گئے اور پتھر بن گئے۔ خزاعہ اور قریش ان کی عبادت کرتے تھے۔ رضی قوم ثمود کا مشہور صنم تھا۔ قبیلہ تمیم اس کی پوجا کرتا تھا اور قبیلہ طے بھی اس کی پرستش کرتا تھا۔ اس کے معبد میں خوشبوئیں سلگاتے تھے۔

مناف صنم کی صورت انسان کی تھی۔ پتھر کا بت تھا۔ اس کی داڑھی نہ تھی۔ سر کے بال رخسار پر بکھرے ہوئے تھے گویا وہ شمسی صنم تھا۔ گردن پر ایک خوبصورت ہار تھا اور سینہ پر چادر کی لپیٹ تھی۔

ذوالخلصہ صنم قبیلہ خثعم، بجیلہ، باحلت، مروت، دوس، ہوازن اور اہل تبالہ کے عربوں کا صنم تھا۔ یہ سفید منقش چٹان تھی جو تاج کی طرح بنی ہوئی تھی۔ لوگ اس کے پاس پانسے ڈلنے آتے تھے۔ اسے ہار پہناتے تھے۔ گیہوں اور جو کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ اس پر دودھ چڑھاتے تھے۔ اس سے سفید شتر مرغ باندھتے تھے۔ اس کو کعبہ یمانی بھی کہتے تھے۔ اس کو خوشبوؤں اور دودھ سے غسل بھی دیتے تھے۔

سعد ساحل جدہ پر ایک لمبی چٹان تھی۔ بنی کنانہ اور بنی ملک اس کی پرستش کرتے تھے۔ قبیلہ یشکر بھی اس کا پجاری تھا۔

ذی الکفین قبیلہ دوس کا بُت تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک موجُود رہا۔ اسے آگ سے جلایا گیا یہ لکڑی کا بت تھا۔

ذوالشری شمالی عرب کا مشہور بت تھا۔ بنی حارث اس کی عبادت کرتے تھے۔ حجرِ اسود کی طرح تھا۔ اقیصر قبیلہ قزاعہ، لخم، جذام، عاملہ اور غطفان کا صنم تھا۔ اس کا حج کرتے تھے اور اس کے سامنے سر منڈاتے تھے اور بالوں کے ساتھ کچھ صدقہ دیتے تھے۔

نہم قبیلہ مزینہ بنی ہوازن، بجیلہ اور خزاعہ کا صنم تھا۔ ان سب میں اس کی پوجا ہوتی تھی۔

الفلس قبیلہ طے کا صنم تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسے مسمار کیا تھا۔

الشمس بنی تمیم کا صنم تھا۔ اس کا مندر بھی بنا ہوا تھا۔ قبیلہ ضبہ، تمیم، عدی اور ثور اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس کے نام پر نام بھی رکھے جاتے تھے مثلاً عبد شمس۔

تمیم کے اصنام میں ایک صنم تیم تھا۔ اس کے نام پر بھی نام رکھے جاتے تھے۔

جیسے عبدتیم اور تیم اللہ وغیرہ۔

کتاب الاصنام میں تو صرف مندرجہ بالا اصنام کا ذکر ہے لیکن اور بھی بہت سے اصنام تھے جن کا ذکر ابنِ کلبی نے اپنی دوسری کتابوں میں کیا ہے۔ ان میں سے یہ بُت خاص طور پر مشہور ہیں۔

الاشہل ــــ بلج ــــ جریش ــــ الدار ــــ الشارق ــــ صدا ــــ عوض ــــ عوف ــــ مرحب ــــ ذریح الجسد ــــ غنم ــــ نہیک وغیرہ۔

ابوذر غفاریؓ کافی دیر چُپ چاپ کھڑے اصنام کے متعلق قصیدہ گووں اور داستان گووں کی مدح سرائی سنتے رہے اور جب رات خوب بھیگ گئی تو ان سب پر نیند کا غلبہ طاری ہوا اور وہ سب ایک کے بعد ایک سوتے چلے گئے۔ بالکل سناٹا چھا گیا تو ابوذر غفاریؓ صنم منات کے پاس آئے۔ اسے حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور کہنے لگے۔

"منات! تو ایک بت ہی تو ہے۔ جو نہ ہدایت دے سکتا ہے اور نہ گمراہ کر سکتا ہے۔ تو عاجز ہے قادر نہیں۔ مخلوق ہے خالق نہیں۔ نہ تجھ میں طاقت ہے نہ قوت۔ تو عبادت کے لائق نہیں۔ لوگ کیوں تجھ پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ تیرے لیے قربانیاں کرتے ہیں۔ بیشک یہ لوگ سخت گمراہی میں ہیں۔"

اب ابوذرؓ نے غصّے میں ایک پتھر اٹھایا اور منات پر دے مارا۔ اپنی جگہ پر واپس آئے اور گہری نیند سو گئے۔

صبح ہوئی، منات کے پجاری جاگے۔ اپنے معبود کا طواف کرنے لگے تاکہ روانگی سے پہلے برکت حاصل کریں۔ طواف کرنے کے بعد وہ لوگ اپنے اونٹوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ انیس بھی آئے اور ابوذرؓ کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگے جیسے وہ اُن کا رازِ دل معلوم کرنا چاہتے ہوں۔ ابوذرؓ اپنے کسی خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بھائی سے کوئی بات نہ کی۔ انیس نے اُن کے حال پر چھوڑ دیا اور کچھ نہ کہا۔ قافلہ نے

غفار کی طرف رُخ کیا۔ ابوذرؓ بدستور اپنے خیال میں منہمک رہے حتیٰ کہ قافلہ مقام فج تک جا پہنچا۔ آپ نے اردگرد دیکھا تو ایک پہاڑی سلسلہ تھا۔ سوچنے لگے ان پہاڑوں کو کس نے قائم کیا اور زمین کو کس نے بچھایا؟ اسی قسم کے خیالات موجزن رہے۔

آخر قافلہ غفار پہنچا۔ ہر طرف قبرستان کی سی خاموشی چھا رہی تھی۔ ابوذرؓ گھر میں داخل ہوئے۔ چاہا کہ سفر کی تھکاوٹ دُور کرنے کے لیے سو جائیں لیکن نیند نہ آئی۔ اُن کے خیالات انہیں نہ جانے کہاں اُڑائے لیے جا رہے تھے۔ اپنے خیالات ہی میں مستغرق رہے اور اسی حالت میں شام ہو گئی۔ (طبقات ابن سعد)

انیس آئے تو بھائی کو بحالتِ خشوع و خضوع کھڑے پایا۔ تھوڑی دیر چُپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"بھیا یہ کیا کر رہے ہو؟"

ابوذرؓ آواز کی طرف متوجہ ہُوئے۔ دیکھا کہ بھائی آپ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بولے

"نماز پڑھ رہا ہوں۔"

"کس کے لیے؟" انیس نے پوچھا۔

"اللہ کے لیے۔" ابوذرؓ نے جواب دیا۔

"نماز تو سوائے نہم یا منات کے کہیں جائز نہیں۔" انیس نے کہا۔

"میں منات یا کسی بُت کے لیے نماز نہیں پڑھتا۔ میں نے اپنے اندر کی آواز سے ایک ایسے معبود کی راہ پالی ہے۔ جو پتھر کے معبودوں جیسا نہیں وہ عظیم ہے، قادر ہے۔ نہ اُسے عقل پا سکتی ہے، نہ بحث و تحلیل۔ وہ ایک سب سے بڑی طاقت ہے جس کی میں تعظیم کرتا ہوں۔"

"تو کیا تم ایسے معبود کی نماز پڑھتے ہو جسے نہ تم پا سکتے ہو اور نہ دیکھ سکتے ہو؟" انیس نے کہا۔

ابوذرؓ بولے۔

"ہاں میں اسے دیکھ نہیں سکتا لیکن اس کی نشانیاں دیکھ لی ہیں۔"

انیس بولے۔

"عجیب باتیں کرتے ہو بھیّا۔ اپنے سامنے کھڑے معبودوں کو چھوڑتے ہو۔ جنہیں اگر تم چاہو تو پالو۔ اگر بلاذ تو وہ تمہارے قریب ہیں۔"

ابوذرؓ نے جواب دیا۔

"یہ معبود تو پتھر ہیں جو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان"۔

"عقل کے ناخن لو بھیّا۔ اپنے باپ دادا کی عقلوں کا مذاق اڑاتے ہو" انیس نے کہا۔

"ہمارے باپ دادا غلطی پر تھے۔ غلطی کوئی بھی غلطی ہے۔ غلطی کا علاج غلطی سے کرنا کیا اچھی بات ہے۔" ابوذرؓ نے جواب دیا۔

"ہمارا دین مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور ہے۔ ذرا سوچو تو سہی ہم میں سے جب کوئی سفر کرتا ہے اور کہیں قیام کرتا ہے تو دو چار پتھر جمع کر لیتا ہے۔ جو پتھر بھلا لگتا ہے اس کو پوجنے لگتا ہے اور باقی پتھروں سے چولہا بنا لیتا ہے۔ یہ کیا مذاق ہے؟"

انیس نے کہا۔

"یہ تو ہم سفر کی حالت میں اس لیے کرتے ہیں کہ ہم کعبہ پر بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ چُنا ہوا پتھر کوئی اپنی ذات کی بنا پر نہیں پوجا جاتا بلکہ اساف و نائلہ کے قائم مقام کر کے پوجا جاتا ہے اور ان بتوں کے نائب کی حیثیت سے پوجا جاتا ہے جو کعبہ میں دھرے ہیں۔"

"اساف اور نائلہ دونوں زانی تھے۔ اساف نائلہ عورت پر عاشق تھا۔ دونوں حج کے لیے آئے۔ کعبہ میں داخل ہوئے۔ لوگوں کو غافل پایا تو زنا میں مشغول ہو گئے اور مسخ ہو کر پتھر ہو گئے۔ حاجی لوگ جاگے تو دیکھا مسخ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے دونوں کو کعبہ کے پاس رکھ دیا۔ مدتوں رکھے رہے تو لوگ ان کی پوجا کرنے لگے۔ یہ ہیں ان لوگوں کے معبود۔"

"میں کہتا ہوں ان نشانیوں کے بارے میں تمہارا خیال ہے جو ان سے ظاہر ہوئیں؟" انیس نے کہا۔

"ان سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوا اور نہ ہو گا۔ جو کچھ ہوا اللہ کی طرف سے ہوا۔ جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔ ان لوگوں کی اندھی عقیدت ان بتوں کے سر سہرا باندھ دیتی ہے۔ کل کی بات ہے ہم منات کے لیے حج کرنے گئے۔ اس امید پر کہ وہ بارش برسائے گا لیکن ایک بوند نہیں برسی۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا۔ یہ سمجھنا کہ وہ ہمارے کسی قصور پر ہم سے ناراض ہے خود کو دھوکا دینا ہے۔ منات کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

ابو ذرؓ کی باتوں نے اپنے بھائی کے دل پر بڑا اثر کیا۔ خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

جاہلی تصوّرِ توحید

جاہلیت میں عرب کی کل کائنات بُت پرستی میں مبتلا تھی۔ خُدا کے ساتھ اُس کے کئی اور شریک انہوں نے بنا لیے تھے۔ اُن کی توحید، توحید ناقص تھی اور بے دینی و بے اعتقادی اُن کا خمیر بن گئی تھی۔ عقلی زندگی اور تمدنی کیفیت بھی ابتدائی حالت میں تھی۔ ماورائے کائنات پر اُن کی نظر نہ اُٹھتی تھی۔ ان حالات کے باوجود جیسا کہ انسانیت اور فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر قوم میں کچھ مصلح اور صاحبِ فکر ہوتے ہیں جو عام روش سے ہٹ کر انسانی اصلاح کے لیے سوچتے ہیں۔ اس قسم کے چند مصلح اور حق پرست عرب میں بھی ضرور پیدا ہوئے جنہیں احناف یعنی عام روش سے ہٹا ہوا کہتے تھے۔

عرب کے دورِ ظلمت و جہالت میں دو چار ایسے بھی ہوئے جن کی عقلِ سلیم نے بُت پرستی اور عام اخلاقی پستی کو گوارا نہ کیا۔ لیکن اُس اندھیرے اور جہالت کے زمانے میں وہ صرف اسی قدر کر سکے کہ انہوں نے بت پرستی سے انکار کیا اور ترقی یافتہ راہ کی تلاش کی۔

ان لوگوں نے حقیقت کو پانے اور اچھی راہ تلاش کرنے کے لیے کفر و ظلمت سے نکل کر باہر کا سفر بھی کیا۔ دوسرے ممالک میں جا کر یہودیوں اور نصرانیوں سے مل کر ان کی معلومات حاصل کیں۔ بعض نے یہودیت اور نصرانیت قبول کی اور دو ایک ایسے بھی ہوئے جنہیں یہودیت و نصرانیت کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر تسلّی نہ ہوئی اور انہیں اس میں بھی وہ نہ ملا جس کی انہیں تلاش تھی لہذا واپس آگئے اور بقیہ زندگی

اچھی باتیں بیان کرنے اور بُت پرستی کو ترک کرنے میں گزاری۔ ایسے لوگ جو نہ یہودی تھے نہ نصرانی اور نہ بُت پرست بلکہ بُت پرستی کو چھوڑ کر ایک خُدا کی طرف مائل تھے حنفا یا احناف کہلائے۔

یہ احناف کسی ایک مستقل رائے اور ایک دین پر نہیں تھے بلکہ ان میں سے ہر ایک کی ایک علیحدہ رائے تھی۔ ان میں کوئی فکری تنظیم نہ تھی۔ وہ کوئی جماعت یا گروہ نہیں رکھتے تھے۔ اُن کا ایک دُوسرے سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ ایسے لوگ مختلف قبائل میں اکا دکا ہوتے۔ ان لوگوں نے بھی یہ چاہا کہ لوگ شراب پینا اور بُرے کام کرنا چھوڑ دیں۔

امیہ بن صلت ثقفی قبیلہ سے تھا۔ اپنی حکمت و دانش اور شاعری پر ناز ہونے کی وجہ سے عرب کے دُوسرے اُمرا و مشائخ کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کر سکا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کیا۔ مشرکین کو آپ کے خلاف بھڑکایا۔ بدر میں قتل ہونے والے کافروں کا مرثیہ کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شاعری سُن کر فرمایا تھا۔

"اِس کے کلام میں ایمان اور اس کے دل میں کفر ہے۔"

اُمیہ بن صلت کے کلام میں وہ تمام ٹکڑے ہیں۔ وہ تمام دینی اصلاحات اور قصص ہیں جو قرآن میں ہیں۔ بعض مشرکین نے کہا کہ قرآن میں یہ چیزیں امیہ بن صلت کی شاعری سے لی گئی ہیں یا دونوں نے تورات سے لی ہیں۔ زہیر بن ابی سلمٰی سبعہ معلقہ کا مشہور شاعر تھا۔ وہ عقلاً و حکمائے عرب میں سے تھا۔ اس کے کلام میں اللہ کے وجود کا اقرار ہے اسی طرح ابوذرؓ اللہ کے وجود کے قائل تھے۔ اسے لاشریک سمجھتے تھے۔ توحید پرست تھے۔ راہزنی سے توبہ کی تو عاقبت سنوارنے کے لیے خدا کی عبادت و پرستش سے رجوع کیا۔ آخرت کا خیال اکثر عربوں میں موجود تھا اور ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو ان چیزوں کو اساطیر الاولین (پہلوں کی داستانیں) اور افک قدیم (پرانا جھوٹ) کہہ کر لغو قرار دینے کی کوشش کرتا تھا۔

ترکِ وطن

بارش نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ قحط نے قبیلے والوں کو بہت تنگ کیا تو ابوذرؓ کی والدہ نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا۔

"بارش تو نہیں ہوگی جس کی وجہ سے ہم بہت تنگ آگئے ہیں میں چاہتی ہوں تم دونوں کو ساتھ لے کر اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

دونوں بھائیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"جو آپ کی رائے ہے وہی ہماری رائے ہے۔"

اور اسی دن شام کو ابوذرؓ اور انیس اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ماموں کے گھر روانہ ہو گئے جہاں خوشحالی کا دور دَورہ تھا۔ بھائی نے اپنی بہن اور بھانجوں کی خوب مہمان نوازی کی۔ ان کے قیام کے لیے خیمے خالی کر دیئے۔ جہاں ابوذرؓ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ چین و آرام سے رہنے لگے۔ تو یہ بات اُس قبیلے کے چند شر پسند لوگوں کو بڑی ناگوار گزری۔ وہ ہر وقت اِسی ادھیڑ بُن میں رہنے لگے کہ جیسے بھی ہو ماموں اور بھانجوں میں پھُوٹ ڈال دی جائے۔ ابوذرؓ کے ماموں کو سیر و شکار کا شوق تھا۔ کبھی کبھی اس غرض سے گھر سے باہر چلا جاتا تھا۔ مخالفوں نے اس کو غنیمت سمجھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ ابوذرؓ کا ماموں سیر و شکار سے واپس آیا تو شر پسند لوگوں نے اس سے کہا۔

"جب تم باہر جاتے ہو اور گھر میں کوئی نہیں رہتا تو تمہارا بھانجا انیس گھر والوں پر انسری کرتا ہے۔ ابتری پھیلاتا ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کا ناک میں

دم ہے۔"

آپ کے ماموں کی عنایات آپ کے بھائی انیس پر بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ لہذا شکایات کا ان پر کوئی خاص اثر نہ ہوا تاہم وہ بشر تھے۔ ایک دن موقع پا کر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"انیس تم ایسا کیوں کرتے ہو؟"

اس جملے کا سننا تھا کہ ابوذر غفاریؓ آپے سے باہر ہو گئے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ فطری طور پر کڑے مزاج کے آدمی تھے۔ دوسرے غربت و مسافرت میں انسان کا دل بہت چھوٹا ہو جاتا ہے، وہ کسی معمولی بات کی تاب نہیں لا سکتا اور پھر یہ شکایت چونکہ سراسر غلط تھی انہیں اس بات کا خیال بھی آیا کہ اگر اسی طرح ہم لوگوں کی شکایتیں ہونے لگیں تو کوئی وقت ایسا بھی نہ آجائے کہ ماموں کے گھر سے بے عزت ہو کر نکلنا پڑے۔ آپ نے اپنے ماموں سے کہا۔

"آپ نے تمام گزشتہ احسانات کی نہروں کو گدلا کر دیا۔ بس اس کے بعد ہمارا آپ کے ساتھ رہنا ممکن نہیں۔"

[بحوالہ صحیح مسلم و بخاری]

ماموں کو کیا خبر تھی کہ محض اتنی سی بات پوچھنے سے ابوذرؓ کا یہ حال ہوگا۔ وہ ہکا بکا ہو کر رہ گیا اور ابوذر غفاریؓ نے اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ وہاں سے کوچ کر جانے کی تیاری کر لی۔ ماموں نے بہت روکا مگر ابوذر غفاریؓ نے ایک نہ سُنی۔ وہ منظر بڑا دردناک تھا جبکہ ان لوگوں کے اونٹ قبیلے سے نکل رہے تھے۔ خود حضرت ابوذر غفاریؓ کا بیان ہے۔

"ماموں اپنے منہ کو کپڑے سے ڈھانپ کر روتے جاتے تھے۔"

[بحوالہ صحیح مسلم و بخاری]

حضرت ابوذرؓ اور اسلام

آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے پوری دُنیا ذلت و ظلمت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جسم انسانیت کے نشیبوں میں تاریکی ہی تاریکی تھی۔ کہیں اُجالا نہ تھا۔ اس دَور کے انسانوں کے عقائد زندیقانہ و ملحدانہ تھے۔ توہمات پرستی اور روایات پرستی اپنے پُورے عروج پر تھی۔ زندگی کے شیشوں کے گھر توڑنے کے لیے وقت کے ہر لمحہ کے ہاتھ میں ایک پتھر تھا۔ خصوصاً سرزمین عرب کے باشندوں کا یہ حال تھا کہ سرزمین حجاز بدکاری و زناکاری کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔

وہ لوگ سیدھے راستے کو چھوڑ کر ٹیڑھے راستوں پر چلے جا رہے تھے۔ الجھنوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ان کی بدکاریاں اور سیاہ کاریاں کچھ ایسی علامتیں تھیں جو اُن کی رُوح کا سرنامہ بن گئی تھیں۔ اُن کی برائیاں ان کے تشخص کا تعارف بنی ہوئی تھیں۔ ان کی زندگی زندگی نہیں صدائے بازگشت تھی زندگی کی۔ جن کی شرافت ضمیر کی پھانسی پر چڑھی ہوئی تھی۔ فتنہ و فساد اور شورش و بدامنی کا یہ عالم تھا کہ کوئی انسان کسی وقت بھی اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھتا تھا۔ طبقہ اناث کی مظلومی یہ تھی کہ عرب کے عہدِ جاہلیت میں ولی جس سے چاہتا تھا عورت کو اس کے پلے باندھ دیتا۔ عورت اپنا عندیہ ظاہر کرنے یا دخل دینے کی قطعاً مجاز نہ تھی۔

اسلام سے پہلے لونڈیوں پر ایک ظلم یہ روا رکھا گیا تھا کہ وہ حصول آزادی کے بعد بھی شوہر سے نجات حاصل نہ کر سکتی تھیں۔ وہ مختلف ناروا طریقوں سے انہیں زچ کرتا رہتا تھا۔

اسلام سے پہلے عرب میں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی۔ مرد، عورتوں کو حقیر سمجھتے تھے اور اُن کی حیثیت نہ صرف ایک جائداد منقولہ کی سی تھی بلکہ بعض اوقات قمار بازی میں داؤ پر لگادی جاتی تھیں۔ عہد جاہلیت میں صنفِ نازک کو جن مظالم کا تختۂ مشق بنایا گیا تھا ان میں ایک ظلم یہ بھی تھا کہ خاوند کے مرنے پر اس کا وارث اس کی بیوی کا بھی مالک ہو جاتا تھا۔ بسا اوقات مرنے والے کے ورثا بیوہ کو اس غرض سے بھی ایذائیں دیتے تھے کہ وہ مال جو اس نے شوہر کی وراثت میں پایا ہے واپس کر دے۔

اہلِ عرب لڑکیوں کو ترکہ کا کوئی حصہ نہ دیتے تھے۔ نابالغ لڑکوں کو بھی اس حق سے محروم رکھتے تھے۔ حائضہ عورت کو انتہا درجے کا نحس قرار دے رکھا تھا۔ جب کسی عورت کو ماہواری آتی تو اس بے گناہ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔ اس کو گھر سے علیحدہ کر دیا جاتا۔ گھر کے تمام افراد اس کے ساتھ کھانے پینے سے احتراز کرتے۔

عرب دو حقیقی بہنوں یا بیوی کی حقیقی خالہ یا پھوپھی سے بیک وقت نکاح کر لیتے تھے۔ بیکس منکوحات کی ایذا رسانی کے لیے اُن کا یہ معمول تھا کہ بلاتعداد طلاقیں دیتے اور پھر عدت کے اندر رجعت یعنی رجوع کر لیتے۔ اس طرح وہ بیچاریاں ہمیشہ بیچ میں معلق رہتی تھیں۔ جفا پیشہ مرد نہ ان کو بساتے تھے اور نہ آزاد کرتے تھے۔

اس زمانے میں عرب میں یہ بھی ایک مذموم رسم جاری تھی کہ اکثر لوگ بیوی کو طلاق دے کر گھر میں محبوس اور پابند رکھتے تھے اور اس کو نکاح ثانی نہیں کرنے دیتے تھے۔ اس سے کبھی تو مطلقہ کو خواہ مخواہ ستانا منظور ہوتا تھا۔ اور کبھی یہ مقصد ہوتا تھا کہ اس کو دق کر کے ادا کیا ہوا مہر واپس لے لیں یا معاف کرا لیں۔ کبھی مطلقہ کو نکاح ثانی سے اس لیے روکتے تھے کہ اپنی بیوی کو دوسرے کے نکاح میں جانا عار خیال کیا جاتا تھا۔ اگر مرد غصے میں آکر بیوی سے ظہار کر بیٹھتا تو دونوں میں دائمی جدائی ہو جاتی اور عورت ساری عمر مرد پر حرام سمجھی جاتی تھی۔

اسلام نے کفارہ کے ذریعے اس تباہ کاری کی تلافی کی۔ مرد کا اپنی عورت کو غصے میں ماں یا بہن کہنا۔ اپنے محرمات نسبی سے تشبیہ دینا اصطلاح شرعی میں ظہار کہلاتا ہے۔

عربوں میں نکاحوں کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ اہلِ عرب کثیر الازدواجی میں ضرب المثل تھے اگر کوئی یتیم لڑکی مالدار اور صاحبِ جمال ہوتی تو اس کا کوئی ایسا ولی جس سے ملتِ ابراہیمی کے بموجب اس کا نکاح جائز ہوتا اس سے نکاح کر لیا کرتا۔ اور اگر لڑکی بدشکل ہوتی تو نہ اُس سے نکاح کرتا اور نہ کسی سے کرنے دیتا۔ یہاں تک کہ وہ بیچاری کڑھتے کڑھتے موت سے ہم آغوش ہو جاتی اور وہ اُس کے مال و زر پر قبضہ جما لیتا۔

عہدِ جاہلیت میں عرب کے کسی خاندان کا کوئی آدمی مارا جاتا تو اس کا بدلہ لینا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا۔ یہ جذبہ اس عقیدہ کی تولید کا باعث ہوا کہ مقتول کی رُوح پرندے کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور جب تک انتقام نہیں لے لیا جاتا وہ شور کرتی رہتی ہے۔ ان روایات کی بنا پر مقتول کے خون کا انتقام ، عربی خاندانوں کی اخلاقی زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا تھا اور بیسیوں قبیلے اس جاہلانہ تصادم میں باہم اُلجھے رہتے تھے اور پھر انتقام گیری کا یہ خاندانی فریضہ کسی مختصر سی مدت میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا بلکہ یہ ایک ایسا غیر متناہی سلسلہ تھا کہ صدیاں گزر جانے پر بھی خاندان ایک دوسرے کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ متصادم و منتقم خاندانوں کے آدمی برابر موت کے گھاٹ اُترتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے عرب بھر میں رزم و پیکار کے لامتناہی سلسلے قائم ہو گئے تھے اور عرب کی زمین اس کشت و خون کی وجہ سے لالہ زار بنی رہتی تھی۔

اہلِ عرب میں محبتِ اولاد کا جذبہ بہت کمزور تھا۔ بعض لوگوں پر تو افلاس و ناداری کی وجہ سے اولاد بارِ خاطر تھی۔ بعض کی سیرت دحمیت اولاد کو برداشت نہ کرتی تھی اور کچھ لوگوں کو اُن کی وحشت و بربریت نے محبتِ اولاد کے جذبہ سے خالی کر رکھا تھا۔ بے رحم ماں باپ اپنے ننھے بچّوں کو بتوں اور فرضی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ ان کے ادراکات و تعقلات میں دیومالائی تاثرات رچے بسے ہوئے تھے۔ مراد مانی جاتی تھی۔ اگر وہ پُوری ہو جاتی تو خود اپنے ہاتھ سے بچے کو ذبح کر دیتے تھے۔ توہم پرست ضعیف الاعتقاد جہلا کی کثرت تھی انکی اوہام پرستی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ عرب کی سرزمین سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے

بد اطواریوں کے حصار میں گھری ہوئی تھی۔ ان لوگوں کی یہ عادت بد بھی تھی کہ جہاں کسی بچے کو اکیلا دیکھ پاتے اسے پکڑ کر غلام بنا لیتے یا غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیتے۔
عربوں کی اخلاقی حالت بہت ابتر و زبوں تھی۔ یہ لوگ سخت اکھڑ اور وحشی واقع ہوئے تھے۔ ذرا سی بات پر لڑنے لگتے تو تلواریں نکل آتیں۔ شرک و بدعات میں مبتلا تھے۔ اس دور میں عرب میں کوئی عورت غیر مردوں سے پردہ نہ کرتی تھی۔ یہ آزادی فسق و فجور میں ترقی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ نہ صرف حیوانوں بلکہ انسانوں پر بھی ہولناک مظالم توڑے جاتے تھے۔ مسلسل جنگ و خوں ریزی اور وحشت و بربریت نے ان کو نہایت بے رحم بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ دشمنی میں عورتوں اور بچوں کو بھی زندہ جلا دیتے تھے۔ جب کوئی شخص قتل ہو جاتا تو مقتول کے لوگ قاتل کے خاندان میں سے جس کسی کو چاہتے پکڑ کر قتل کر دیتے حالانکہ اسلام کا قانونِ عدلت یہ ہے کہ قاتل کے سوا کسی دوسرے سے قصاص نہ لیا جائے۔

اکثر قبائل رہزنی و غارت گری میں شہرہ آفاق تھے اور انہوں نے اس کو ذریعہ معاش بنا رکھا تھا۔ بدکاری، سیہ کاری، زنا کاری اور فواحش کی گرم بازاری تھی اور اتنی ارزانی تھی کہ زخموں اور عصمتوں کے بازار لگے تھے۔ شعرا فواحش و زنا کاری کے واقعات کو بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اشعار میں بیان کیا کرتے تھے۔ عرب رؤسا اپنی لونڈیوں سے عصمت فروشی کراتے اور ان کی آمدنی کھاتے۔ حریفانہ معرکوں میں ظالمانہ و بہیمانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ غزوہ اُحد میں کفار نے مسلمان شہیدوں کے ناک و کان کاٹ ڈالے تھے۔ ان کا مثلہ کیا تھا۔

اغلام اور دوسرے خلافِ فطرت افعال و اشتغال اور عملی رذائل کو جرائم نہ سمجھا جاتا تھا۔ رشوت خوری کا بازار گرم تھا۔ سردارانِ قوم کو سجدہ کرنے کا رواج تھا۔ سود خوری کو حرام نہ سمجھا جاتا تھا۔ ام الخبائث شراب عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ خمریت میخواری کی ہر دلعزیزی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے قریباً ڈھائی سو نام تھے۔ بڑے بڑے شرفا اعلانیہ

شراب نوشی کرتے تھے اور کثرتِ استعمال کا یہ عالم تھا کہ ہر گھر میکدہ و خمخانہ بنا ہوا تھا۔
جاہلی عرب میں شعر گوئی حدِ کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔ جاہلی شاعری میں خمریات، صنمیات، نگاریات، فحاشیات، محاربات اور مفاخرت و منافقت کا مادہ بکثرت پایا جاتا تھا۔ اعشیٰ، زیبائی، جریر، امراء القیس، عمرو، طرفہ، سوق، ربیع بن زیاد، مخل حطیہ اپنی قادر الکلامی کی وجہ سے بڑے معروف و ممتاز جاہلی شعرا تھے۔ شعر و سخن سے انہوں نے خوب زر اندوزی کی تھی۔ شاعر نابغہ شیوخ عرب کی مدح سرائی و قصیدہ گوئی کی بدولت اس قدر دولت مند ہو گیا تھا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا۔
فحش گوئی بھی عربوں کے عام معمولات میں داخل تھی۔ امور قبیحہ و شہوانیہ کو صریح شرمناک الفاظ میں بیان کیا کرتے تھے۔ قمار بازی اور سود اکم تولنے کا عام معمول تھا۔ دکاندار مال بیچنے میں دروغ گوئی سے کام لیتے تھے۔ جھوٹی قسمیں کھا کھا کر خریدار کو پھانستے تھے۔ حرم مکہ میں بالخصوص دن کے اُجالے میں برملا حرکاتِ شنیعہ کا ارتکاب ہوتا تھا۔

لونڈیاں اور غلام جفا کاروں اور سفاکوں کے جور و ستم کا بُری طرح تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ اہلِ شرک خدائے قدوس عز اسمہ کو ایسے ناموں سے پکارتے تھے جس کا خدا کی کسی آسمانی شریعت نے اذن نہیں دیا تھا۔ مشرک مُردار اور حشرات الارض کھاتے تھے۔ نجاست و غلاظت سے پرہیز نہ کرتے تھے۔ انسانیت کو بدنام کیا جا رہا تھا۔
انسانیت تنکوں کی طرح جہالت و وحشت کی آندھی میں اُڑی جا رہی تھی۔ انسانیت پر جبلت مرگ طاری تھی۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ خون ہی خون تھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مجبور و مقہور زیر دست انسانوں کا ہر قدم موت کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ اُن کے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ اور اگر کچھ تھا تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُن کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نئے خطرے سے عبارت تھا اور وہ کسی خطرے کے لیے مسلح نہ تھے حادثات و اتفاقات کے انجانے حملے انہیں بوکھلائے ہوئے تھے ؎

تھا ان سے قبل فروغِ بہار نامعلوم   ریاضِ دہر تھا اک دفترِ خزاں کی طرح

خدا کی اس دُنیا میں وسیع پیمانے پر انسانوں کا قتل عام جاری تھا۔ انسان، انسان کی گھات میں لگا بیٹھا تھا۔ بالا دستوں کی قلمرو میں شناخت کے لیے شاہراہِ انسانیت کے لُٹے پُٹے قافلوں کو روک رہی تھی۔ ہر نظر کا نیزہ اس کے راستے کی رکاوٹ بنا ہوا تھا ہر خون بھری آنکھ درندوں کی طرح اُس کی خوشبو سونگھتے ہوئے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کا سراغ لگا رہی تھی۔ مجروح انسانیت اندھیروں میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ ہزار زخم تھے اور چارہ گر کی بات نہ تھی۔

انسانیت کے چہرے کی ہر شکن اور اس کے دھول سے اَٹے ہوئے سر کا ہر بال ایک دردناک کہانی تھا۔ آبلہ پائی کے درد و کرب سے وہ ایک قدم نہ اٹھا سکتی تھی۔ اور فاصلے تھے کہ صدیوں پر پھیل گئے تھے۔ زیرِ عتاب انسانیت کی دعائیں نہ گردشوں کو گرفتار کر سکتی تھیں اور نہ تقدیر پر کمندیں ڈال سکتی تھی۔ وہ آدمی جو کسی آدمی کے کام آئے ہر آدمی اس آدمی کو ترس رہا تھا۔ آدمیت اُس دور میں عدم آدمیت کا نام تھا۔ اپنے زخموں میں رینگتی ہوئی انسانیت کے ہر عضو پر خوف و ہراس کی پھپھوندی لگی ہوئی تھی۔ کتنی ہی نفسیاتی الجھنوں نے اس کے ذہن میں مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے اور ان الجھنوں کا کوئی نام نہ تھا۔ جو نہ ہونا چاہیئے تھا وہ ہو رہا تھا ؎

ایک وحشت تھی یہ ساری دُنیا
ایک زندانِ تخیل تھی یہ ساری دُنیا

خُدا کی ایک ہی بستی کے باشندے ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنے ہوئے تھے۔ بھائی، بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا۔ اُن کی آپس کی معاشی لوٹ کھسوٹ نے ایسے مسائل پیدا کر دیئے تھے کہ پردہ نشین عورتیں جن کا کوئی سہارا نہ تھا صرف پیٹ کی خاطر اندھیروں میں نکلنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ بس ایک فاقے کو ٹالنے کے لیے کئی بار اپنی عصمت فروخت کرتی تھیں۔

سرمایہ دار ایسے ایسے سکینڈل چلا رہے تھے کہ ناداروں کی لاشوں کے ڈھیروں پر اُن کے تاج محل تعمیر ہوتے جا رہے تھے۔ چور اُچکے چوہدری کہلاتے تھے۔ ملمع ساز و

جعل ساز مفکر اعظم اور زعیم کبیر بنے بیٹھے تھے جو اپنا مطلب نکالنے کے لیے یزداں کو بھی بیچ رہے تھے۔ ملت فروشوں کی بن آئی تھی۔ ایک چہرے میں کئی چہرے لگا کر انسان انسان کو فریب دے رہا تھا۔ خدا کی زمین پر فتنہ و فساد برپا تھا۔ اس عہد تاریک کے انسانوں نے اجتماعی انتشار کا شکار ہو کر اپنی ہیئت اجتماعیہ کی ہیئت ہی بگاڑ لی تھی۔ خدا بیزاری کے آسیب نے انہیں بُری طرح دبوچ رکھا تھا۔ انہیں خود خُدا ہونے کا جنون ہو رہا تھا۔ وہ زندہ تھے لیکن زندہ نہیں تھے۔ زمین پر رینگتے ہوئے کیڑوں کی طرح حرکت کرنے اور سانس لینے کا نام ہی زندگی نہیں۔ آزادی و اختیار اور زندگی کی اعلیٰ اقدار سے آشنا نہ ہوتے ہوئے پامال گھاس کی مانند اور گندگی میں رینگتے ہوئے کیڑے کی طرح جینا انسانیت کی موت ہے۔

اس دورِ ذلت و ظلمت میں احتجاج ایک سنگین جرم تھا۔ انسانیت نے مصلحت سے زبان سی لی تھی۔ لوگ لوگوں کا خون پی رہے تھے۔ ہر فرعون و نمرود کے دربار میں اس کی ہیئت و جلال کے قصیدے پڑھنے کے لیے زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہزاروں غلام سر جھکائے کھڑے رہتے تھے۔ ہر شداد کے قصرِ بلند کے دروازے پر اس کو ظلِ الٰہی، جہاں پناہ، خداوند اور پالنہار کہنے والے مدح سراؤں کی بھیڑ لگی رہتی تھی تاکہ اس خود ساختہ خُدا کی چوکھٹ پر جبیں سائی و سجدہ ریزی کریں۔ جبکہ سجدہ بس ایک ہی ذات کو زوا ہے اور وہ تنہا خدا کی ذات ہے جو اپنی جملہ صفات کے ساتھ اپنی ذات میں تنہا ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں۔ جس کا نام اس کی تمام صفات کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طاہر ہے۔

ظلم کو عدل ــــ اندھیرے کو اُجالا ــــ شعلے کو شبنم ــــ کانٹے کو پھول ــــ زہر کو امرت ــــ رہزنی و روباہی کو رہنمائی ــــ جبر و استبداد کو مصلحت ــــ رندی و ریاکاری کو پارسائی ــــ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ سے تعبیر کر کے ٹھوس و مسلمہ حقیقتوں اور صداقتوں کے خلاف کوئی سازش کرنا انسانیت کا شیوہ نہیں اور نہ انسانیت کا نام ان جھنجھلاہٹوں پر نقاب ڈالنے کی سرنوشت ہو سکتا ہے جس میں غاصبوں قاتلوں، راہزنوں، ریاکاروں، شرپسندوں، فتنہ پردازوں اور انسانیت کے دشمنوں کو

کسی قسم کی رعایت دی گئی ہو۔ ظالم کو ظالم اور موقع شناس کو موقع شناس نہ کہنا انسانیت کے مسلک میں گناہ عظیم ہے اور انسانیت کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ کسی دباؤ یا لالچ میں آ کر سونے چاندی کے اُن ہیکلوں کی تبلیغ واشاعت کرے جنمیں پتھر کو خُدا اور انسان کو پتھر سمجھا جاتا ہے۔

جن کے اندر قوت واقتدار کے تختِ طاؤس پر متمکن جبر واستبداد کے نمائندے وحشت و بربریت کے نقیب، تباہی و بربادی کے کارندے، تاخت و تاراج کے علمبردار ابلیس واہرمن کے پرستار بڑی دھوم دھام سے خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں، زمین پر اس دوروزہ زندگی میں خُدا بن کر چلتے ہیں۔ خُدا کے لب ولہجہ میں بات کرتے ہیں جو خُدا نہیں ہوتے مگر چاہتے ہیں اُن کو خدا کہا جائے اور خُدا کی یہ زمین جو صرف خُدا ہی کی ہے ان کی ملکیت و میراث سمجھی جائے مگر اس دورِ ذلت و ظلمت میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو انسانیت کو جراَت اظہار پر اُبھارتا۔ انسانیت کی ترجمانی کے لیے اس کو اپنی زبان دے دیتا اور وہ اپنے دشمنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بیباکی سے یہ کہہ سکتی ؂

میری زبان پہ تالے لگا دیے تم نے
مگر خیال کے بارے میں کیا ارادہ ہے

حقیقتاً اس وقت کوئی ایسا انسان نہ تھا جو انسان کو اپنی رفاقت کا سہارا دیتا۔ انسانیت اُس وقت بے سہارا تھی۔ بے وارث تھی۔ اس کا کوئی رفیق نہ تھا۔ اُس کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور پھر حضور تشریف لائے تو گمراہی ولادینی کے گھور اندھیروں میں سسکتی ہوئی سرزمین حجاز بقعۂ نور بن گئی۔ جمالِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کائنات جگمگا اُٹھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے محسنِ اعظم تھے۔ تعمیرِ انسانیت کی ہر اینٹ پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لکھا ہے۔ یہ حضورؐ ہی کی نظرِ کرم تھی جو انسانیت کو اس کے وجود کے دائرے میں لائی۔ قلیل النوم و کثیر الصوم سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا

اسوۂ حسنہ قوائے انسانیت کے لیے بہترین محرک عمل ہے۔

حضورؐ انسانیت کا مرکز و محور ہیں۔ حضورؐ انسانی زندگی کی عظمتوں اور رفعتوں کے علمبردار تھے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل اور اُن سے متعلقہ حقائق و معارف کا تجزیہ اور ان کی تفسیر بھی۔ سرکار دو عالمؐ کی تکوین انسان اکبر کی تکوین ہے جو آسمانوں کی تکوین سے زیادہ مشکل ہے۔

حضورؐ کی عظمت و رفعت کا حدود اربعہ بیان کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ حضورؐ کا وجود علوی امکانات کی حد سے ماورا تھا۔ جس کی حد بندی ممکن نہیں ہو سکتی۔ حضورؐ کا تخلیقی عمل افزائش جمالِ الٰہی اور پردہ کشائی سِرِ کن فیکون کا عمل ہے۔

حضورؐ کے افکار عالیہ کے شاہکار محض نقش گری کی مہارت نہیں بلکہ حقائق کے واضح شعور اور اُن پر حضورؐ کے فکر و عمل کی کامل گرفت کی علامت ہے۔ داخلی کیفیات کو انسان کامل ہونے کی حیثیت سے حضورؐ نے صرف محسوس ہی نہ کیا بلکہ گہری نظر سے ان کا مشاہدہ بھی کیا۔

عالم انسانیت کے ائمۂ فکر میں سرورِ دیںؐ وہ پہلے مدبر و مفکر ہیں جنہوں نے فکر و تدبر کی نئی راہیں انسانوں پر کھولیں۔ جنہوں نے انسانی جہد و بقا کی عالمگیر تحریک کو انتہائی ندرت و رفعت اور شدتِ احساس کے ساتھ فکر و خیال اور جوش و جذبہ کے انقلاب سے آشنا کیا۔ انسانی زندگی کے صرافہ کے آپؐ پہلے ساہوکار تھے جنہوں نے کم عیار سکوں کو اپنے لمس مبارک سے درہم و دینار بنا دیا اور انسانیت کے عالمی بینک کا سارا کاروبار آپؐ ہی کے دیئے ہوئے قرض سے چل رہا ہے۔

انسانیت کی عظمت و رفعت کا نیا اُفق آپؐ ہی کی فہم و فراست سے پیدا ہوا۔ القا و الہام اور کشف و شہود کے ہر لمحہ وارده کو حضورؐ نے اپنے ادراکات و تعقلات میں پرو لیا۔

حضورؐ بحرِ ہستی کے وہ ناخدا ہیں جو انسانیت کی ہلاکت کے گرداب میں پھنسی کشتی کو سلامتی سے ساحلِ مراد تک لے آئے جو ٹوٹی ہوئی تھی۔ جس کے پیندے میں

سوراخ تھے۔ جس کے چپو اور پتوار ٹوٹے ہوئے تھے جس کے سب بادبان پھٹ چکے تھے۔ تیز و تند مخالف ہواؤں کی یورش تھی اور ساحل بڑی دُور تھا۔ حضورؐ نے زندگی کو دیکھنے، برتنے اور پرکھنے کا انسانوں کو ایک منفرد زاویہ نگاہ دیا۔ حضورؐ کے افکار و اقدار نوعِ انسانی کے فکری و تہذیبی تشخص کا نشان اور معیار ہیں۔ حضورؐ انسانوں کی فکری و تہذیبی تونگری کا مظہر ہیں۔ آپ کتنے عظیم ہیں قرآن و اسلام آپ کی عظمت کی ایک عظیم دستاویز ہی تو ہے۔ آپؐ کی بصیرت و نقش گری نے دُنیا بھر کے انسانوں میں انسانی سوجھ بوجھ پیدا کرنے اور ان کی فکری و نظری سمتوں کا تعین کرنے میں ایک عہد آفریں عہد ساز کردار انجام دیا۔

آپؐ کی سیرت و کردار کا مطالعہ انسان اور کائنات کا مطالعہ ہے۔ خدا کا مطالعہ ہے۔ آپؐ انسانوں کی مخصوص تاریخی، ذہنی، تہذیبی و ثقافتی روایات کے پارکھ تھے۔ انسانوں کے محسوسات و تاثرات کے ترجمان اور زندہ رہنے کی جدوجہد میں ان کے زندہ رہنے کے امکانات کے مبشر۔ انسانیت کی تشکیل و تعمیر، اس کی بقائی کش مکش اور دستوری جدوجہد میں آپ کا تخلیقی عمل افزائش جمال، قوت و حیات اور پردہ کشائی راز کا عمل ہے۔

حضورؐ اپنے دَور سے الگ بھی تھے، آگے بھی تھے۔ اُس سے بلند بھی تھے۔ آپ قادر مطلق کے سائے میں فولادی چٹان کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے، مخالفت کی آندھیوں کی یورش میں حوادثات کے تھپیڑوں پر نوعِ انسانی کی تقدیر رقم کرتے رہے۔ حضورؐ کی فہم و فراست اور افکار و اقدار کو نوعِ انساں کی فکری و تہذیبی شخصیت و حیثیت کا نشان کہا جا سکتا ہے۔

آپؐ کی ولادت، آپؐ کی پاکیزہ زندگی اور اس کے مبادیات انسانوں کا قابلِ فخر انسانی ورثہ ہیں۔ حضورؐ کی شخصیت کا مطالعہ مُردہ انسانیت کے احیاء موتہ کا مطالعہ ہے۔ سیاسی، معاشی اور جغرافیائی ماحول کی ناموافقت کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی نسل انسانی کے کوہ بلند بن جانے کا مطالعہ ہے۔ ارتقائے تخلیقی اور بیکراں کائنات

کی وسعتوں کا مطالعہ ہے۔ نوع انساں کے رنگ رس کو، نوع انساں کی دھوپ چھاؤں کو، نوع انساں کے منظر و پس منظر کو اگر آپؐ کی بصیرت نگاہ اور آواز میسر نہ آتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ فکری گہرائی وگیرائی کے اعتبار سے انسانیت نہ جانے کب تک تقریباً اندھی، بہری اور گونگی پڑی رہتی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ملتِ ابراہیمیہ کے اتمام واحیار کے لیے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسیہ کا انتخاب کر چکی تھی۔ حرار کا واقعہ، نزول وحی اور بعثت کے واقعات گزر چکے تھے۔ اسلام کی تبلیغ کی آواز عشیرۃ الاقربین سے گزر کر ام القریٰ میں گونج چکی تھی۔ گھر گھر اسلام کا چرچا ہونے لگا تھا۔

اسی زمانہ میں مکہ معظمہ سے کوئی مسافر حضرت ابوذرؓ کے پڑاؤ کی طرف سے گزرا۔ آرام لینے کے لیے کچھ دیر وہاں ٹھہر گیا۔ بات سے بات چلی تو حضرت ابوذر غفاریؓ کی گفت گو سے اسے معلوم ہوا کہ آپ بھی ایک خدا کے ماننے والوں میں سے ہیں۔ اس نے کہا:

"یہ تم جو کچھ کہتے ہو مکہ کا ایک شخص بھی اسی کا مدعی ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ پیغمبر ہے۔ اسے آسمان سے وحی آتی ہے۔"

اُس نے تو روا روی میں یہ خبر سنائی لیکن یہ سنتے ہی حضرت ابوذر غفاری کا دل بلیّوں اچھل پڑا۔ سنبھل کر بیٹھ گئے اور بڑی بے چینی کے ساتھ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کرنے لگے کہ اس کا اصلی وطن کہاں ہے۔ کس قبیلے کا آدمی ہے۔ مکہ کے کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ راہ گیر نے سارا نشان دپتہ بتا دیا۔

(طبقات ابن سعد۔ صحیح مسلم)

حضرت ابوذر غفاریؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو کچھ سُنا تھا اُن کے اندر ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ دل یہی چاہتا تھا کہ پَر لگ جائیں تو اُڑ کر مکہ پہنچ جائیں۔ لیکن کچھ اپنے بُت پرست بھائی کا خیال اور کچھ مشرکہ ماں کی خاطر دل میں ایک طوفان کو دباتے رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و الفت کا ایک بیکراں سمندر تھا۔

جو حضرت ابوذر غفاری کے سراپے میں موجزن تھا۔

آپ کے بھائی انیس شاعر تھے۔ کسی شاعر سے مقابلہ کرنے مکہ جا رہے تھے آپ نے اپنے بھائی سے کہا:

"میرے لیے یہ کرتے آنا کہ وہ جو اپنے کو نبی خیال کرتا ہے اور کہتا ہے آسمان سے اس کے پاس خبریں آتی ہیں ذرا اس کی حالت دریافت کرنا۔ سننا کہ وہ کیا کہتا ہے۔"

اے۔ جے۔ کیمرون اپنی تصنیف "ابوذر الغفاری" میں اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"Abu Dharr heard of a Meccan. Who claimed to be a prophet and sent his brother unays to Mecca to get information about him"

اِدھر حضرت انیس مکہ روانہ ہوئے۔ ادھر ایک شعلۂ انتظار تھا جو اُن کے رخصت ہوتے ہی حضرت ابوذر غفاریؓ کے دل و جگر میں بھڑکنے لگا تھا۔ رہ رہ کر اس کی شدت بڑھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی سختی کو آپ اسلام کے بعد بھی نہ بھولے تھے۔ اپنی بے چینی و بے قراری کی داستان سُناتے ہوئے فرماتے ہیں:

فراث علی (انیس نے بہت دیر لگائی)

(طبقات ابن سعد)

انیس کے واپس آنے تک انتظار کا وقت حضرت ابوذرؓ پر بہت گراں گزرا۔

آخر وہ واپس آئے تو آپ نے ان سے پوچھا۔

"تم نے اتنی دیر کیوں لگائی؟"

انیس نے جواب دیا:

"اسی آدمی سے ملنے میں دیر ہو گئی۔"

"تم نے اسے کیسا پایا؟" آپ نے دریافت کیا۔

"اس کا طریقہ وہی ہے جو آپ کا ہے اور وہ اچھی باتوں کی تعلیم دیتا ہے اور

یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے کو رسول گمان کرتا ہے۔"

(طبقات ابن سعد)

اے۔ جے۔ کیمرون اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تالیف "ابوذر الغفاری رضی" میں لکھتا ہے:

"Unays heard the Messenger of Allah in Mecca. On his return he told Abu Dharr that this man exhorted to good Works and forbade evildoing and that he Commanded people to behave Virtuausly."

حضرت ابوذر رضی نے فرمایا۔

"مکہ والے اُن کو کیا کہتے ہیں۔ کیسا آدمی سمجھتے ہیں ؟

انیس نے جواب دیا۔

"کوئی اسے شاعر کہتا ہے اور کوئی کاہن کہتا ہے۔"

حضرت ابوذر غفاری رضی اس موقعہ پر غایت نشاط و مسرت کے ساتھ اپنے اسلام کی حالت بیان کرتے ہوئے خاص اس مقام پر فرمایا کرتے تھے۔

"انیس حالانکہ ایک اچھا شاعر تھا مگر اس نے یہی کہا کہ میں نے ایک اچھے شعر کے اوزان پر ان کے شعروں کو خوب جانچا۔ شعر تو وہ یقیناً نہیں ہیں۔ رہا کاہن تو میں سیکڑوں کاہنوں سے بھی ملا ہوں۔ ان کی باتیں سُنی ہیں لیکن اس شخص کے کلام کو ان کی گفتگو سے کوئی واسطہ نہیں۔ قسم خُدا کی وہ سب کے سب جھوٹے ہیں۔ یقیناً یہ سچا ہے۔"

[طبقات ابن سعد۔ صحاح]

حضرت انیس کے اظہارِ خیال نے حضرت ابوذر غفاری رضی کے سب غم غلط کر دیئے اور مسرورانہ لہجہ میں فرمایا:

ماشفیتی مما اردت

ہم جس مرض کا علاج چاہتے ہیں تم اس کی شفا نہیں لائے۔

O

اس کے بعد فرمایا۔

O

الحقنی اذھب فانظرُ

O

انیس! اب تم میری جگہ گھر رہو۔ ذرا میں جاتا ہوں تاکہ میں بھی تو دیکھوں کہ کون ہے۔

O

[طبقات ابنِ سعد]

سفرِ مکّہ مکرمہ

حضرت ابوذر غفاریؓ مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ آپ کی پیٹھ پر ایک چھوٹی سی سیاہ مشک پانی سے بھری ہوئی تھی اور زنبیل میں تھوڑے سے مقل کے دانے تھے۔

مقل کے بارے میں صاحب تاج العروس لکھتے ہیں کہ دوم کے پھل کو بھی کہتے ہیں جو کھجوروں سے مشابہ ہوتا ہے۔

آپ تلاش محبوب میں تن تنہا حجاز کے ریگستانوں کو طے کرنے لگے۔ جذبۂ شوق نے کٹھن مرحلوں اور منزلوں کو آسان کیا۔ آپ سوار مکہ میں پہنچ گئے۔

حرم میں قریش اکثر آتے جاتے رہتے تھے اور ہو سکتا تھا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ بہت جلد کسی سے دریافت کر کے اُس آستانہ تک پہنچ جاتے جس کے لیے قبیلہ غفار سے پا کوبی کرتے ہوئے وادی بطحا اور وہاں سے حرم تک لائے گئے تھے، لیکن یہ طبع غیور کو گوارا نہ تھا کہ احسان کو جس سے گرانبار احسان ممکن نہیں تھا، بُت پرستوں کے وسیلے سے سر پر رکھا جائے۔ صحیح بخاری میں ہے۔

فالتمس النبي صلى الله عليه وسلم وكره

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خود ڈھونڈنا مگر اس کو ناپسند کرتے ہوئے کہ کسی سے پوچھیں۔

[مسلم و طبقات]

جبیں گرد رہِ عشق لب پہ مہر سکوت

دیارِ غیر میں پھرتا ہوں آشنا کے لیے

آپ مکہ میں گھومتے ہوئے حرم کے پاس پہنچ گئے اور ایک غریب الوطن

مسافر کی طرح ایک کونے میں پڑے رہے تین دن گزر گئے۔ مشکیزہ کا پانی اور مقل کے دانے ختم ہو چکے تھے۔ بھوک ستاتی تو زمزم کے چند گھونٹ پی لیتے۔

ایک دن اسی دوران آپ کو خیال گزرا کہ جس کو ڈھونڈتا ہوں اگر وہ نہیں ملتا تو چلو اس کے کسی غلام سے پتہ پوچھ لینا چاہیئے مصلحت تو کفاروں سے نہ پوچھنے تک محدود ہے۔

غرض یہ سوچ کر تاک میں رہے۔ اتفاق سے ایک مفلوک الحال آدمی حرم میں داخل ہوا۔ آپ نے قیاس کیا کہ اس جماعت کا جو حال بیان کیا جاتا ہے وہ اس شخص سے بہت مطابقت رکھتا ہے، اس سے دریافت کرنا چاہیئے۔ آپ اس کے قریب پہنچے اور پوچھا۔

أَيْنَ الَّذِي تَدْعُونَ الصَّابِيَ "

جس کو تم لوگ صابی کہتے ہو کہاں رہتا ہے ؟

وہ شخص دراصل کفار کے گروہ کا آدمی تھا۔ اس وحشت ناک سوال کے سنتے ہی اس کا ماتھا ٹھنکا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جماعت کا آدمی ہے۔ اچانک اس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور شور مچانے لگا۔

هٰذا صابی

قریش اس وقت مسلمانوں کے خلاف بپھرے ہوئے تھے۔ اس کافر کی آواز صاعقہ ابر کی طرح حرم میں گونجی۔ پھر جو حشر ہوا حضرت ابوذرؓ کی زبانی سنیئے۔

فَمَالَ اَهْلُ الْوَادِي بِكُلِّ مَدرةٍ وَعَظمٍ فَخَرزتُ مَغشيًّا عَلَيَّ

ڈھیلے اور ہڈیاں اٹھائے مکہ والے مجھ پر ٹوٹ پڑے اور اس قدر مارا کہ میں چکرا کر گر پڑا۔ (طبقات ابن سعد۔ صحیح مسلم)

عاشق رسول ابوذرؓ کو اتنا مارا کہ بیہوش کر کے پھینک گئے۔ خدا جانے کس وقت ہوش آیا۔ لہو میں لت پت ہو رہے تھے۔ بوٹی بوٹی دکھ رہی تھی۔ لیکن آشفتہ سری بدستور قائم تھی۔ مسلک عشق میں سکون بحر کا انتظار روا نہیں۔ اس میں کود پڑنے کا وقت تو وہ ہے جبکہ طوفان اپنے عروج پر ہو۔

آپ اُٹھے، زمزم پر آئے، پانی پیا، خون دھویا اور پھر حرم کے کونہ میں آ پڑے۔ آپ نے اس حادثہ کے بعد حرم محترم کو نہ چھوڑا۔ جو دھن تھی بندھی رہی۔ انہی دنوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ ایک طرف ایک شکستہ حال مسافر پڑا ہوا ہے۔ آپ کو رحم آیا۔ قریب آکر دریافت فرمایا۔

ممن الرجل — کہاں کے آدمی ہو؟

حضرت ابوذرؓ نے جواب دیا۔

من غفار — قبیلہ غفار سے ہوں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔

ثم الی منزلك — اپنی فرودگاہ تشریف لے چلیں۔

مقصود یہ تھا کہ میرے گھر چلیں۔ مسجد میں تکلیف ہوگی۔

حضرت ابوذرؓ چونکہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو چکے تھے۔ اظہارِ مدعا تو نہ کیا اُٹھے اور چُپ چاپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ ان کے گھر پہنچے۔ حضرت ابوذرؓ خود بیان کرتے ہیں کہ نہ انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا اور نہ میں نے کچھ بتایا۔

یہ رات حضرت ابوذر غفاریؓ نے جناب علی کرم اللہ وجہہ کے غریب خانہ میں گزاری صبح ہوئی تو اپنی مشک اور زنبیل لئے پھر تلاش محبوب میں نکلے۔ مکہ کے کوچہ و بازار میں شام تک مصروف جستجو رہے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ رات ہونے کو آئی تو پھر حرم میں جا بیٹھے۔ مغرب کے بعد پھر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ دیکھا کہ مسافر اب تک موجود ہے۔ آپ نے فرمایا۔

اما ان للرجل ان یعرف منزله

کیا آدمی کے لیے اپنی فرودگاہ تک جانے کا وقت نہیں؟

حضرت ابوذر غفاریؓ اُٹھے اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو لئے۔ گھر پہنچ کر آپ سے جو ہو سکا اپنے مہمان کی مہمان نوازی کی۔ اور آج آپ سے نہ رہا گیا۔ فرمایا!

ماالذی امرک ؟

آخر تم کو کیا چیز یہاں لائی۔ کس ضرورت سے آتے ہو ؟
آپ جس مقصد کے لیے مکہ آئے تھے وہ ابھی تک پورا نہ ہوا تھا۔ دل بھرا ہوا تھا۔ پیمانہ صبر چھلک پڑا۔ بولے
"اگر عہد کرتے ہو تو میں بتاؤں"۔
حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عہد کیا تو حضرت ابوذر غفاریؓ کہنے لگے۔
"میں نے سنا ہے کہ مکہ میں ایک شخص پیدا ہوا ہے جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں۔ یہ سن کر میں نے اپنے بھائی کو دریافت حال کے لیے بھیجا لیکن اس نے کچھ تشفی بخش خبر مجھے نہیں سنائی۔ آخر میں خود اس شخص سے ملنے کے لیے آیا ہوں"۔
(طبقات ابن سعد)

اس کے جواب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا
قال فانه حق وهو رسول الله فاذا اصبحت فاتبعني فاني ان رايت شيئا اخاف عليك قعدت کاني اريق الماء فان مضيت فاتبعني حتى تدخل مدخل ۔ (بخاری)
یہ بالکل سچ ہے کہ وہ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ جب صبح ہو تو تم میرے ساتھ چلو۔ راستے میں اگر ایسا واقعہ نظر آئے (مثلاً کوئی کافر سامنے آجائے) کہ جس میں مجھے خطرہ معلوم ہو تو میں بیٹھ جاؤں گا۔ اپنا جوتا درست کرنے لگوں گا۔ پھر جدھر میں جاؤں چلے جانا۔ حتیٰ کہ جہاں داخل ہو جاؤں تم بھی وہاں آجانا۔
صبح ہوئی تو دونوں ساتھ چلے۔ آگے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور پیچھے پیچھے ان کے حضرت ابوذر غفاریؓ۔ راستے میں کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ حتیٰ کہ کاشانہ نبوت کا دروازہ سامنے آگیا۔
حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت ابوذر غفاریؓ کو ساتھ لیے اندر داخل ہو گئے

سرور کائنات اپنے طلعت قدوسی پر چادر ڈالے ہوئے ایک چبوترے پر آرام فرما رہے تھے۔ حضرت علیؓ نے اشارہ کیا۔ حضرت ابوذرؓ بے تابانہ دوڑ پڑے اور سلام عرض کیا۔
حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔ سلام کا جواب دیا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو اپنے پاس بٹھالیا۔ فرمایا۔

"مِمَّنْ اَنْتَ"

"تم کس قبیلے کے آدمی ہو؟"

ابوذرؓ بولے۔

مِن غفار

قبیلہ غفار سے ہوں۔

یہ سنتے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سر پکڑ لیا۔

فاھوی بیدہٖ الی جبھتہٖ

آپ نے اپنے ہاتھ کو پیشانی کی طرف جھکایا۔ (طبقات)

اس سے متعلق مختلف رائیں ہیں کہ آپؐ نے ایسا کیوں کیا۔ ایک روایت ہے کہ آپؐ نے اس انتساب کو ناپسند فرمایا جیسا کہ خود حضرت ابوذرؓ سے اس کی شرح میں مروی ہے۔

قلت فی نفسہٖ کرہٖ انی انتسبت الی غفار

میں نے اپنے دل میں کہا کہ شاید غفار کی طرف میرے انتساب کو آپؐ نے ناپسند فرمایا۔

ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ یہ سُن کر متعجب ہوئے اور ایسا کرنا محض اظہار تعجب کے لیے تھا۔ طبقات کی ایک دوسری روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

عجب النبی صلی اللہ علیہ وسلم انھم یقطعون الطریق
فجعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرفع بصرہ فیہ ویصوبہ
تعجبا من ذالک لہ ما کان یعلم منھم۔

"آپؐ کو تعجب ہوا کہ غفار تو رہزنی کرتے ہیں (ان میں ایسا شخص کیونکر پیدا ہو سکتا ہے) اس کے بعد آپؐ نے پھر متعجب ہو کر اپنی نظر اُن پر ڈالی

اور کبھی جُھک کر دیکھتے کیونکہ غفاریوں کے حالات سے واقف تھے۔"

(طبقات - بخاری)

اس معنی خیز خاموشی کو توڑتے ہُوئے حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا۔

"آپؐ جو کچھ کہتے ہیں وہ مجھے سُنایئے۔"

آپؐ نے فرمایا۔

"میں نہیں کہتا خُدا فرماتا ہے۔"

حضرت ابوذرؓ نے کہا۔

"وہی سُنایئے۔"

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی ایک سورۃ تلاوت فرمائی۔ جسے سُن کر حضرت ابوذرؓ بڑے متاثر ہوئے۔ عرض کیا۔

آپؐ واقعی خدا کے نبی ہیں۔ میں آپؐ پر ایمان لاتا ہوں۔"

حضرت ابوذرؓ نے کلمہ شہادت پڑھا۔

اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔

ابوذرؓ مسلمان ہو گئے۔ مکہ معظمہ میں اُس وقت مسلمانوں کی کل تعداد پانچ تھی جن میں پانچویں حضرت ابوذرؓ تھے۔ آپ چند روز کاشانۂ نبوت میں رہے۔ ایک زمانہ گزر چکا تھا حضرت ابوذرؓ کو اپنا گھر چھوڑے ہوئے۔ کپڑے بالکل میلے کچیلے ہو رہے تھے۔ حضور رسالت مآبؐ نے دو کپڑے نکال کر دیئے۔ حضرت ابوذرؓ نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔

حضورؐ نے فرمایا۔

"کفار مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ تم نے دیکھا کہ کیسی کیسی ایذائیں حق پرستوں کو دی جا رہی ہیں۔ مناسب یہی ہے ابوذرؓ تم اپنے قبیلے میں چلے جاؤ۔ وہاں لوگوں میں دین کی تبلیغ کرو۔ اُس عرصہ تک وہیں رُکے رہو جب تک تمہیں جہاد کا حکم نہ ملے۔"

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے روانہ کرنے سے تبلیغ و دعوتِ اسلام کا کام

لینا منظور تھا اور ساتھ ہی یہ بھی مدنظر تھا کہ ابوذرؓ شعلہ مزاج اور طبعاً سخت آدمی ہیں خواہ مخواہ اُن کو دشمنان اسلام کے ہاتھوں تکالیف نہ اُٹھانا پڑیں۔ جیسا کہ پہلے ایک واقعہ آپ کو حرم میں پیش آچکا تھا۔ حضورؐ کا ارشاد گرامی سُن کر ابوذرؓ نے عرض کیا۔

"اَحْسَنْتَ"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔ مگر حضورؐ میں نہیں جا سکتا جب تک (کلمہ) اسلام کے ساتھ مسجدِ حرام میں جاکر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہ کر دوں۔"

لا ارجع حتی اصرخ باسلام فی المسجد الحرام

حتیٰ کہ غیظ و غضب میں آکر قسم کھا کر اُٹھے۔ بخاری کا جملہ ہے۔

والذی نفسی بیدہ لاصرخن بھا بین المصوا نیھم۔

"قسم اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ان کافروں کے درمیان میں جاکر چیخوں گا۔"

حضورؐ سے رخصت ہو کر مسجدِ حرام میں پہنچے۔ اس وقت قریش کا مجمع وہاں موجود تھا۔ اُن میں گھس کر آپ نے گرج کر نعرہ بلند کیا۔

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ

قریش میں اس نعرے کے سننے کی تاب کب تھی۔ شور مچاتے ہوئے حضرت ابوذرؓ پر ٹوٹ پڑے۔

"صبوت ـ صبوت"

کافروں نے نہایت بیدردی سے آپ کو زدوکوب کیا۔ آپ لہولہو ہو رہے تھے لیکن زبان پر بدستور کلمۂ شہادت جاری تھا۔ حسنِ اتفاق سے حضرت عباسؓ کا اُدھر سے گزر ہوا۔ آپ نے قریش سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ارے کیا کرتے ہو، انہیں پہچانتے ہو؟ یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے جدھر سے

تمہارے شامی تاجروں کا راستہ ہے۔"
حضرت عباسؓ قبیلہ کے مقتدر لوگوں میں سے تھے۔ مکہ والے آپ کی بڑی عزت کرتے تھے
خدا کے ایک بندے پر تشدد کرنے والوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔
صحیح بخاری میں ہے کہ دوسرے دن ابوذرؓ پھر حرم میں پہنچے اور کلمہ شہادت بلند آواز
سے پڑھنا شروع کیا۔ کفار پھر ان پر ٹوٹ پڑے اور مارنا شروع کر دیا۔ حضرت عباسؓ کو پہلے
ہی خدشہ تھا، آئے تو کل ہی کا واقعہ پیش نظر تھا۔ آپ نے پھر کفار کو سمجھایا۔
"کیا تمہارا ارادہ ہے کہ قریش کے قافلے لوٹ لئے جائیں۔ آخر تم کیا کرتے ہو؟"
حضرت عباس کے منع کرنے پر کفار اس بار بھی رک گئے۔
بہرکیف حضرت ابوذرؓ نے عملی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ ثابت کر دیا کہ
آپ کفار کے مظالم سے ڈر کر آستانہ رسولؐ کو نہیں چھوڑ رہے بلکہ اس لیے کہ حضورؐ کے
ارشاد گرامی کی تعمیل اور خدا کے دین کی نشر و اشاعت کے اہم فریضہ کی انجام دہی پیشِ نظر
ہے۔ اس کے بعد آپ مکہ معظمہ سے بصد حسرت و یاس رخصت ہوئے۔

حضرت ابوذرؓ کی تبلیغی مہم

حضرت ابوذرؓ اس مقام پر پہنچے جہاں آپ کے بھائی اور والدہ فروکش تھے۔انیس آپ کے پہلے ہی سے بڑی بے چینی سے منتظر تھے۔نہایت گرم جوشی سے ملے اور پوچھا۔
"آپ نے کیا کیا؟"
ابوذرؓ نے جواب دیا۔

"اسلمت وصدقت"

"میں مسلمان ہوگیا ہوں۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتا ہوں"۔
حضرت انیسؓ کے دل میں بھی وہ نور کہ ہی میں چمک چکا تھا جسے سینے میں دبائے بیٹھے تھے۔یہ سنتے ہی کہنے لگے۔

"مالی رغبة عن دینك فاننی قد اسلمت وصدقت"

"مجھے آپ کے دین سے انکار نہیں اور میں بھی مسلمان ہوا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی"۔
حضرت ابوذرؓ کی تبلیغی مہم کی پہلی کامیابی تھی۔جس کی آپ کو ازحد خوشی ہوئی۔فرماتے ہیں،

"فاتینا اُمّنا"

"ہم دونوں بھائی مل کر والدہ کے پاس آئے"
اور اسلام پیش کیا۔آپ کی والدہ نے سعادت مند بیٹوں کو مسلمان دیکھ کر فرمایا۔
"مجھے بھی اس دین سے کوئی نفرت نہیں۔میں مسلمان ہوئی اور جن چیزوں کی تم دونوں نے تصدیق کی میں بھی اس کی تصدیق کرتی ہوں۔اپنے قبیلہ کے قریب

لوگوں کو خدا سے ڈراؤ۔"

"وانذر عشیرتک الاقربین"

دونوں بھائیوں نے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟ روایات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا۔

"قریش مجھ پر ظلم کر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں انہوں نے مجھے بڑا ستایا ہے۔ اب مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ ان سے انتقام لوں اور ان شاء اللہ اسی مقام کے ذریعے سے مقصد میں کامیابی ہوگی۔"

حضرت ابوذرؓ نے قریش سے اُن کے مظالم کا انتقام لینے کی ٹھان لی جو انہوں نے آپ کے مکہ میں قیام کے دوران آپ پر توڑے تھے۔

۷

حضرت ابوذرؓ کا انتقام

حضرت ابوذرؓ غفاری والدہ اور بھائی کے ساتھ عسفان کی ایک گھاٹی جس کا نام ثنیۃ غزال تھا، میں جا ٹھہرے۔ یہ گھاٹی اس شاہراہ میں واقع تھی جس سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے تھے اور اپنا یہ معمول بنا لیا کہ کفار قریش کا جو قافلہ اُدھر سے گزرتا اسے لُوٹ لیتے۔ جب اُس پر قبضہ ہو جاتا تو اس کے بعد فرماتے۔

"اگر تم خدا کے ایک ہونے پر گواہی دیتے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرتے ہو تو سارا مال ابھی واپس کر دیتا ہوں اور اگر انکار کرو گے تو یاد رکھو تم ایک حبۃ کے مستحق نہیں ہو سکتے۔"

قریش آپس میں مشورہ کرتے کہ وہی ابوذرؓ ہے جو مکہ میں عام طور سے مشہور ہیں اور اس پر وہاں بہت ظلم ہوتے ہیں۔ ایسا کہتے ہے کیا کرنا چاہیئے؟

بعض ایمان لے آتے تھے اور بعض کفر پر ہی قائم رہتے۔ جو مسلمان ہو جاتا آپ اُس کا سارا مال واپس کر دیتے اور جو انکار کرتا اُسے فرماتے۔

"میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ قتل و غارت سے توبہ کر چکا ہوں۔ تمہاری جان بخشی کرتا ہوں۔ جاؤ اپنا راستہ لو صورت حرام۔"

جو لوگ یہاں مسلمان ہوتے تھے مکہ معظمہ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتے تھے۔ اس طرح روز بروز اسلام کی تعداد میں ایک اور اضافہ کی صورت نکل آئی۔

حضرت ابوذرؓ جس کام پر مامور کیے گئے تھے خدا کے فضل سے اس میں غیر متوقع کامیابی ہو رہی تھی۔ اس واقعہ میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر حضرت ابوذرؓ کے ہاتھ پر ایمان لانے

والے محض مال کے طمع سے مسلمان ہوتے تھے تو ان کے لیے بالکل ممکن تھا کہ مکہ میں جاکر پھر جاتے لیکن تاریخ اس کی ایک نظیر بھی پیش نہیں کرتی۔ جو مسلمان ہوتا تھا بس ہمیشہ کے لیے ہوتا تھا کہ حق و صداقت کی روشنی دلوں میں خواہ کسی وسیلے سے بھی پڑے بڑی مشکل سے بجھتی ہے۔

عسفان کی گھاٹی غزال میں آپ ایک زمانہ تک نہایت دلیری سے اسلام کی اس اہم خدمت کو انجام دیتے رہے۔ (مسند امام احمد)

کسی روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت ابوذرؓ عسفان میں کب تک رہے۔ لیکن مسند احمد بن حنبل کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہجرت سے پہلے غفار میں پہنچ چکے تھے۔ (مسند امام احمد)

آپ نے اپنے قبیلے کو دعوتِ اسلام دی۔ خدا کی قدرت اور حق و صداقت کی کشش سے سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ قریب ہی آپ کا حلیف قبیلہ اسلم آباد تھا۔ آپ نے اس قبیلہ سے رجوع کیا۔ دعوتِ اسلام دی، آپ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔ یہ سارا قبیلہ بھی مسلمان ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حضور علیہ السلام مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے۔ حضرت ابوذرؓ سے آپ کے قبیلے نے درخواست کی کہ ہم لوگ یثرب (مدینہ) جاکر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہونا چاہتے ہیں۔ قبیلہ اسلم والوں نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا اور ساتھ دیا۔

۵ھ ہجری کے ابتدائی مہینے تھے کہ قبیلہ غفار اور اسلم کی معیت میں مبلغ اسلام حضرت ابوذرؓ مدینہ منورہ پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دیدار اقدس سے اُن کی آنکھوں بلکہ جانوں کو نوازتے ہوئے فرمایا۔

"غفار غفر اللہ لھا اسلم سالمھا اللہ"

خداوند تعالیٰ غفار کی مغفرت کرے اور اسلم کو خدا سلامت رکھے۔"

(صحاح مسند)

یہ ایک خاص خصوصیت تھی جو حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاندان و قبیلے کے علاوہ آپ نے کسی قبیلے کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ اور اسلم پر بھی یہ رحمت د

برکت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بدولت پھیل گئی۔ قبائل غفار واسلم تو اپنے خیمہ گاہوں کی طرف واپس لوٹ گئے اور حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضورؐ کا دامن تھام لیا اور اس مضبوطی سے تھاما کہ کبھی الگ نہ ہوئے۔

مواخات

مدینے میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے۔ ان کے مذاہب بھی الگ الگ تھے۔ یہودیوں کے متعدد قبیلے بہت طاقتور تھے۔ اپنے جُدا گانہ قلعوں میں رہا کرتے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے پہنچتے ہی ہجرت کے پہلے سال یہ مناسب خیال فرمایا کہ جملہ اقوام سے بین الاقوامی اصول پر ایک معاہدہ کر لیا جائے تاکہ نسل و مذہب کے اختلاف میں بھی قومیت کی وحدت قائم رہے اور سب کو تمدن و تہذیب میں ایک دُوسرے سے مدد و اعانت ملتی رہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں جو معاہدہ ہوا وہ میثاقِ مدینہ کہلایا۔ اس معاہدہ کے جستہ جستہ فقرات درج ذیل ہیں۔

۱۔ ھذا کتابٌ من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین المؤمنین والمسلمین من قریش و یثرب ومن تبعھم فلحق بھم و جاھد معھم۔	۱۔ یہ تحریر ہے محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مسلمانوں کے درمیان جو قریشی یا یثرب کے باشندہ ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ جو مسلمانوں کے ساتھ ملے ہوئے اور کاروبار میں اُن کے ساتھ شامل ہیں۔
۲۔ انھم اُمّۃٌ واحدۃ۔	۲۔ یہ کہ سب لوگ ایک ہی قوم سمجھے جائیں گے۔
۳۔ وان یھود بنی عوف امۃ مع المومنین۔	۳۔ بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک قوم ہیں۔
۴۔ وان بینھم النصر علی من حارب اھل ھٰذہ	۴۔ اور جو کوئی اس معاہدہ کرنے والی قوموں کے ساتھ جنگ کرے گا تو اسکے خلاف

الصحیفۃ۔	سب کے سب مل کر کام کریں گے۔ مسلمان اس کی نصرت کریں گے۔
۵۔ وان بینھم النصح والنصیحۃ والبر دون الاثم۔	۵۔ معاہدہ قوم کے باہمی تعلقات، باہمی خیرخواہی، خیراندیشی اور فائدہ رسانی کے ہوں گے، ضرر اور گناہ کے نہ ہوں گے۔
۶۔ وان الیہود ینفقون مع المؤمنین ماداموا محاربین۔	۶۔ جنگ کے دنوں میں یہودی مسلمانوں کے ساتھ مصارف میں شامل رہیں گے۔
۷۔ وان بطانۃ یہود کانفسھم۔	۷۔ یہودیوں کی دوست دار قوموں کے حقوق یہودیوں کے برابر سمجھے جائیں گے۔
۸۔ وانہ لم یاثم امرئ بحلیفہ۔	۸۔ کوئی شخص اپنے معاہد کے ساتھ مخالفانہ کارروائی نہ کرے گا۔
۹۔ وان النصر للمظلوم۔	۹۔ مظلوم کی مدد و نصرت کی جائے گی۔
۱۰۔ وان یثرب حرام جرفھا لاھل ھٰذا الصحیفۃ۔	۱۰۔ مدینے کے اندر کشت و خون کرنا اس معاہدہ کرنے والی سب قوموں پر حرام ہوگا۔
۱۱۔ وان الجار کالنفس غیر مضار ولا اثم۔	۱۱۔ زنہاری بھی معاہد قوموں جیسے سمجھے جائیں گے۔
۱۲۔ وانہ ماکان بین اھل ھٰذہ الصحیفۃ من حدث او اشتجار یخاف۔	۱۲۔ اس معاہدہ کی قوموں کے اندر کوئی ایسی نئی بات یا جھگڑا پیدا ہو جائے جس میں فساد کا خوف ہو تو اس کا فیصلہ افہام و تفہیم سے کیا جائے۔

○

اس معاہدہ پر مدینے کی تمام آباد قوموں کے دستخط ہو گئے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چاہا کہ گرد و نواح کے قبیلوں کو بھی اس معاہدہ میں شامل کر لیا جاتے۔

اس سے دو فائدے مطلوب تھے۔ ایک تو یہ کہ جو خانہ جنگی قبائل کے درمیان ہمیشہ جاری رہتی ہے اور خلقِ خُدا کے خُون سے خدا کی زمین کو رنگین کرتی رہتی ہے اس کا انسداد ہو جائے گا۔

دوسرا فائدہ یہ کہ قریش مکہ ان لوگوں کو جن سے معاہدہ ہو جائے گا مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ نہ کر سکیں گے۔ امن و سلامتی کے اس معاہدہ کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے پہلے ہی سال ودان تک سفر کیا اور قبیلہ بنی حمزہ بن بکر بن عبد مناف کو بھی اس معاہدہ میں شریک کر لیا۔ اس معاہدہ و عہد نامہ پر عمرو بن فحشی الضمری نے دستخط کئے۔

اسی ارادے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاوّل ۲ھ میں رضوی کی طرف گئے اور کوہ بواط کے لوگوں کو بھی شریکِ معاہدہ کر لیا۔

ان معاہدوں کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان سلسلہ مواخات قائم کیا اور فرمایا۔

"خدا کی راہ میں دو دو شخص آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔"

اور یہ اخوت جن مہاجرین و انصار میں قائم ہوئی ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سید المرسلین، امام المتقین، رسول رب العالمین نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اخوت قائم کی۔ حضورؐ نے علیؓ بن ابی طالب کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا۔

"ھٰذا اخی"

"یہ میرا بھائی ہے"

حضرت امیر حمزہؓ ضیغم اسلام اور زید بن حارثہ میں اخوت قائم ہوئی۔

حضرت جعفرؓ بن ابی طالب جن کا لقب ذوالجناحین اور طیار ہے معاذ بن جبل کا بھائی بنایا۔ حالانکہ جعفر بن ابی طالب اس وقت تک حبشہ سے تشریف نہیں لائے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خارجہ بن زہیرؓ کا بھائی بنایا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عتبان بن مالکؓ سے اخوت قائم کی۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ سے سعد بن ربیع خزرجیؓ سے اخوت قائم ہوئی۔

حضرت زبیرؓ اور سلامہ بن سلامؓ آپس میں بھائی بھائی بنے۔

حضرت سعد بن زیدؓ کو حضرت کعبؓ بخاری کا بھائی بنایا۔
حضرت ابوذر غفاریؓ کی عمرو بن ساعدیؓ سے مواخات قائم ہوئی۔
حضرت عمار بن یاسرؓ کا بھائی ثابت بن عمرؓ بن قیس کو بنایا۔

ایک مملکت و ریاست کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دائرے میں رہنے والے افراد کی معاشی زندگی ٹھیک کرے۔ اور اس کی بنیادی مادی ضروریات پوری کرے۔ حضورؐ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ان مہاجرین کی معاشی زندگی کا تھا جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر مدینے چلے آئے تھے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گتھی کو نہایت حکیمانہ انداز سے یوں سلجھایا کہ مہاجرین و انصار کو بلا کر انصار سے فرمایا۔

"تم میں سے ہر ایک شخص ایک مہاجر کو لے لے اور اپنے بھائی کی طرح اس کی کفالت کا ذمہ دار ہو۔"

انصار نے اس تجویز کو بڑی خندہ پیشانی و مسرت سے تسلیم کیا۔ اس کے بعد حضورؐ ایک مہاجر اور ایک انصار کو بلا کر مواخات یعنی بھائی چارہ کراتے گئے۔ فرمایا!

"تآخوا فی اللہ اخوین اخوین۔"
"اللہ کی راہ میں دو آدمی بھائی بھائی بن جائیں۔"

اس اجتماع میں نوے ۹۰ یا ایک سو اصحاب موجود تھے جن میں سے آدھے مہاجرین اور آدھے انصار تھے۔ مسلمانوں میں اسلامی مواخات کا ایسا ولولہ پیدا ہو گیا تھا کہ خون کے رشتوں سے کہیں زیادہ رشتۂ حق کے ان عزیزوں کو اپنا سمجھنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ اگر ایک مرجاتا تو رشتۂ مواخات کا بھائی اس کا وارث سمجھا جاتا۔

صُفّہ اور اصحابِ صُفّہ

ہجرت کے بعد اسلام نے ایک نئی کروٹ لی اور مسلمانوں کی زندگی نے ایک نئے دَور میں قدم رکھا۔ مدینے میں آنے کے بعد اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی حکومت کا قیام یا ریاست کی تعمیر اسلام کا مقصود نہیں۔ اسلام صرف ایک مثالی قسم کا معاشرہ تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ جس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جنگ کوئی اسلام کا مقصود نہیں، اس کا مقصود تو امن اور سراسر امن ہے۔ لیکن بسا اوقات قیام امن جنگ پر ہی موقوف ہوتا ہے۔ قیام امن کے لیے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اس لیے مجبوراً جنگ کرنا پڑتی ہے۔ بہر حال حضورؐ کی مدنی زندگی میں اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی جو حکومت سے وسیع تر مفہوم رکھتی ہے اور نظامِ حکومت اس کا جزوِ لاینفک ہے۔

اسلامی معاشرے میں مسجد کی اہمیت اس کی اس مرکزی حیثیت کی بنا پر ہے جس سے وہ یادِ خدا، احساسِ ذمہ داری، پابندیٔ وقت، تنظیم و مساوات، مذہبی تعلیم، اصلاحِ معاشرہ اور ایسے ہی دوسرے کئی مسائل کے حل کا باعث بنتی ہے۔

مسجد کا اولیں کام یادِ خُدا کی ترغیب و تلقین ہے اور امام مسجد کا فرض یہ ہے کہ وہ اصلاحِ معاشرہ پر خاص نظر رکھے۔ وہ ہر روز درس کے بعد یا جمعہ کے روز خطبہ میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لے اور لوگوں کو غلطیوں اور کوتاہیوں پر متنبہ کرے۔

مختلف مسائل میں ہر شخص کی ذہنی دسترس اتنی نہیں ہوتی کہ وہ تمام چیزیں قرآن و سنت کی روشنی میں خود سمجھ سکے۔ اس لیے یہ کام امام مسجد کا ہے کہ وہ حالاتِ زندگی پر پوری نظر رکھے اور گمراہی کی نشاندہی کرے۔

مدنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی بنیاد رکھی کیونکہ خدا کے نیک بندوں کے لیے ہر آبادی میں تقدم اسی عمارت کو حاصل ہے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان کے سامنے ایک جگہ خالی پڑی تھی۔ جس میں جھاڑیاں اور کھجور کے درخت تھے۔ وہاں اونٹ بھی بٹھائے جاتے تھے۔ یہ زمین بنی نجار کے دو یتیموں سہل اور سہیل کی ملکیت تھی۔ حضورؐ نے قیمت ادا کر کے مسجد مقدس کی داغ بیل ڈالی اور اس کی تعمیر میں خود بہ نفس نفیس برابر شریک ہوئے۔

ابتدا میں اس مسجد کی دیواریں کچی اینٹوں اور ان گھڑے پتھروں کی تھیں۔ کھجور کی شاخوں کے چھپر بنا کر چھت بنادی گئی تھی۔ اور ان پر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ ستونوں کا کام کھجور کے تنوں سے لیا گیا تھا۔ فرش ناپختہ تھا۔ مینہ برستا تو چھت سے پانی ٹپکتا اور فرش کیچڑ سے دلدل بن جاتا۔ صحابہ کرام کنکریاں اور بجری جھولیاں بھر بھر کر لے آتے اور فرش پر ڈال دیتے۔ اس طرح فرش رفتہ رفتہ ایسا بن گیا کہ چھت ٹپکنے پر کیچڑ کی شکل اختیار نہ کرتا۔ مسجد کا رُخ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا۔ کیونکہ قبلہ اس وقت قرار نہیں پایا تھا۔ مسجد نبوی کی موجودہ عمارت بعد کے تغیرات سے تعمیر ہوئی۔

مسجد نبوی کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے لیے حجرے تعمیر کرائے۔ تعمیر مسجد کے وقت آپؐ کے نکاح میں صرف حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ تھیں۔ لہٰذا مسجد کی مشرقی سمت میں صرف دو حجرے بنے جن کی دیواریں کچی تھیں۔ کھجور کے کھپروں کی چھت جو اتنی اونچی تھی کہ آدمی کا ہاتھ اوپر اٹھتا تو چھت سے جا لگتا دروازوں پر شروع میں کمبل پڑا رہتا تھا۔ پھر ایک ایک کواڑ کے دروازے لگا دیئے گئے۔ رات کو اکثر چراغ نہیں جلتا تھا۔ پھر جیسے جیسے ازواجِ مطہرات آتی گئیں ان کے لیے الگ الگ حجرے بنتے گئے۔

صحن مسجد کے اندر مشرقی حصہ میں ایک چبوترہ سا بنا کر سائبان ڈال دیا گیا تھا یہاں وہ غریب الوطن، غیر شادی شدہ اور بے گھر لوگ پڑے رہتے تھے جنہوں نے اپنی زندگی اسلامی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ لوگ جنگل سے لکڑیاں لا کر بیچتے۔

محنت مزدوری کرتے۔ دُوسرے مسلمانوں کی مدد کرتے۔ ان کا بیشتر وقت عبادت، تلاوتِ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و معیت میں گزرتا۔ ارشادات و فرمودات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سنتے۔ انہیں محفوظ رکھتے۔ دوسروں تک پہنچاتے۔ مشہور راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ بھی اصحاب صفہ میں سے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اگر کہیں سے صدقے کا کھانا آتا تو اصحاب صفہ کے پاس بھیج دیتے۔ جب دعوت کا کھانا آتا تو ان کو بلا لیتے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ اُن کے لیے ایک الگ معلم مقرر تھا۔ جن کے پاس جا کر پڑھتے۔ اسی بنا پر ان میں سے اکثر قاری کہلاتے۔ دعوت اسلام کے لیے کسی کو بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھی بھیجے جاتے۔

بیر معونہ کے واقعہ ہائلہ میں ستر آدمی اصحاب صفہؓ ہی سے بھیجے گئے تھے۔ ابو براء عامر بن مالک بن جعفر رئیس قبیلہ بنو عامر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس کو دعوتِ اسلام دی۔ اُس نے نہ اسلام قبول کیا نہ انکار کیا۔ اتنا عرض کیا کہ اگر حضورؐ اپنے اصحاب میں سے چند لوگوں کو نجد کی طرف روانہ فرمائیں تو مجھے امید ہے کہ اسلام کی اشاعت ہوگی۔

حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے وہاں کے لوگ میرے آدمیوں کے ساتھ غداری نہ کریں۔ ابو براء نے کہا۔ میں اس کا ذمہ لیتا ہوں۔ حضورؐ نے اس کے کہنے سے چالیس صحابہ کو نجد کی طرف روانہ کر دیا۔

مدینہ سے روانہ ہو کر جب یہ لوگ مقام بیر معونہ پہنچے تو حرام بن ملحان کو انہوں نے ایلچی بنا کر رئیس قبیلہ بنو عامر کے بھتیجے عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ جس وقت عامر کے پاس پہنچے اس نے خط کو بھی نہ دیکھا۔ حرام بن ملحان کو فوراً شہید کر دیا اور پھر بنی عامر کو صحابہ کے قتل کرنے کا حکم دیا۔

بنی عامر نے اس حکم سے انکار کیا۔ کہنے لگے ہم ابو براء کے عہد کو نہیں توڑتے۔ وہ حضورؐ سے ان کے واسطے ضامن ہوتے ہیں۔

اب عامر بن طفیل نے بنی سلیم، بنی رعل اور بنی ذکوان کے قبیلوں کو صحابہؓ کے قتل کرنے پر اکسایا۔ وہ آمادہ ہو گئے۔ چاروں طرف سے اصحابِ صفہؓ کو گھیر لیا جبکہ اصحابِ صفہ

بھی تلواریں کھینچ کر ان پر جا پڑے اور سوائے کعب بن زید کے سب اصحاب صفہؓ شہید ہو گئے۔ کعبؓ زخمی حالت میں مقتولین کی لاشوں میں سے کھسک کھسک کر نکل گئے۔

دو اصحاب صفہؓ پیچھے رہ گئے تھے ایک عمرو بن امیہ اور دوسرے منذر بن محمد انصاری۔ ان کو پتہ نہیں تھا کہ صحابہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ جب یہ دونوں قریب آئے تو دونوں نے دیکھا کہ فضا میں گدھ منڈلا رہے ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ ان گدھوں کے منڈلانے کی ضرور کوئی وجہ ہے۔

پھر یہ دونوں اسی سمت میں روانہ ہوئے۔ قریب گئے تو دیکھا کہ ان کے ساتھی اصحاب صفہؓ خاک و خون میں لتھڑے پڑے ہیں اور ان کے گھوڑے خاموش کھڑے ہیں۔ منذر بن محمد انصاری نے عمرو بن امیہ ضمری سے کہا کہ اب تمہاری کیا رائے ہے۔ عمرو نے کہا۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم حضورؐ کی خدمت میں جائیں اور اس واقعہ کی اطلاع دیں۔ انصاری نے کہا۔ میری رائے یہ ہے کہ میں اس جگہ سے واپس نہ جاؤں۔ جہاں ہمارے بھائی اصحاب صفہ شہید ہوئے ہیں۔ ہماری خبر دوسرے لوگ حضورؐ کے گوش گزار کر دیں گے۔ پھر منذر بن محمد انصاری نے دشمنوں کو اس قدر قتل کیا کہ آخر خود بھی شہید ہو گئے۔ عمرو بن امیہ کو دشمنوں نے گرفتار کر لیا۔ پھر جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ عمرو قبیلہ مضر سے ہیں تو انہیں چھوڑ دیا۔

عمرو بن امیہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ عرض کیا۔ صحابہؓ کے شہید ہونے کی خبر حضورؐ کو معلوم ہوئی تو آپ کو بڑا صدمہ ہوا۔ بار بار انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا۔

بخاری شریف میں صفحہ ۳۶ جلد ۱ باب "نوم الرجال فی المسجد" میں لکھا ہے کہ اصحاب صفہ اپنی آنکھوں کو آپؐ کے دیدار پُر انوار کے لیے، کانوں کو آپ کے کلمات قدسیہ سننے کے لیے اور جسم کو آپ کی صحبت و معیت کے لیے وقف کر چکے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ میں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا کہ ان کے پاس چادر تک نہ تھی۔ فقط تہ بند تھا یا کمبل، جس کو وہ اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے اور کمبل بھی اس قدر چھوٹا کہ کسی کی آدھی پنڈلیوں تک پہنچتا اور کسی کے ٹخنوں تک

اور ہاتھ سے اسے تھامتے کہ کہیں ستر نہ کھل جائے۔

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بھی اصحاب صفہ میں سے تھا۔ ہم میں سے کسی کے پاس ایک کپڑا بھی پورا نہ تھا۔ پسینہ کی وجہ سے جسم پر میل کچیل جما رہتا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اصحاب صفہ فقیر تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو صحابہ پر تقسیم فرما دیتے کہ جس شخص کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ ایک کو اور جس کے پاس تین کا کھانا ہو وہ چوتھا اصحاب صفہ اپنے ہمراہ لے جائے۔ یعنی وہ تین ایک اصحاب صفہ کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لے۔ جب شام ہوتی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب صفہ کو لوگوں پر تقسیم کر دیتے۔ کوئی دو کو لے جاتا اور کوئی تین کو۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اسی اصحاب صفہ کو اپنے ہمراہ لے جاتے اور ان کو کھانا کھلاتے۔ (حلیۃ الاولیا ص۳۴۱ جلد ۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بھی اہل صفہ میں تھا۔ جب شام ہوتی تو ہم سب آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو جاتے۔ آپ ایک ایک دو دو کو اغنیاء صحابہ کے سپرد کر دیتے۔ اور جو باقی رہ جاتے ان کو اپنے ساتھ شریک طعام کر لیتے۔ طعام سے فارغ ہو کر ہم لوگ شب کو مسجد ہی میں سو جاتے۔ مسجد نبوی کے دو ستونوں میں ایک رسی بندھی رہتی تھی جس پر انصار اپنے باغات سے انگوروں کے خوشے اور کھجوروں کے گچھے اصحاب صفہ کے لیے لٹکا دیتے تھے۔ اصحاب صفہ ان کو لکڑیوں سے جھاڑ کر کھاتے تھے۔ معاذ بن جبل ان کے منتظم و نگران تھے۔

حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے سے برآمد ہوئے۔ دست مبارک میں عصا تھا۔ دیکھا کہ ایک خراب خوشا لٹکا ہوا تھا۔ آپ نے اس خراب خوشہ پر عصا لگا کر فرمایا۔

"اگر یہ صدقے والا چاہتا تو اس سے بہتر خوشہ صدقہ میں لا سکتا تھا۔"

عبداللہ بن شقیقؓ کہتے ہیں۔ میں ایک سال ابوہریرہؓ کے ساتھ رہا۔ ایک دن فرمانے لگے کہ کاش تو ہمارا وہ زمانہ بھی دیکھتا جب کئی کئی دن ہم پر ایسے گزرتے کہ اتنا کھانا بھی

میسر نہ آتا تھا جس سے ہم اپنی کمر ہی سیدھی کرلیں۔ فاقوں سے ہم اتنے کمزور ہو جاتے تھے یہاں تک کہ مجبور ہو کر پیٹ پر پتھر باندھتے تاکہ کمر سیدھی ہو سکے۔

(فتح الباری ص ۲۴۲ ج ۱۱)

فضالہ بن عبیدؓ سے مروی ہے کہ بسا اوقات اصحابِ صفہ بھوک کی شدت سے حالتِ نماز میں بے ہوش ہو کر گر جاتے تھے۔ باہر سے اگر کوئی اعرابی اور بدّو آتا تو ان کو دیوانہ اور مجنون سمجھتا۔

اصحاب صفہ کی تعداد کم و بیش ہوتی رہتی تھی۔ حلیۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ ان کی تعداد چار سو تک پہنچ چکی تھی جن میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جندب بن جنادہ یعنی حضرت ابوذر غفاریؓ

۲۔ حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراحؓ

۳۔ حضرت عمار بن یاسر ابوالیقظانؓ

۴۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

۵۔ حضرت مقداد بن عمروؓ

۶۔ حضرت خباب بن ارتؓ

۷۔ حضرت بلال بن رباحؓ

۸۔ حضرت صہیب بن سنانؓ

۹۔ حضرت زید بن الخطابؓ (حضرت عمرؓ کے بھائی)

۱۰۔ حضرت ابومرثد کنانہ بن حصین عدویؓ

۱۱۔ حضرت ابوکبشہؓ مولیٰ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

۱۲۔ حضرت صفوان بن بیضاؓ

۱۳۔ حضرت ابوعبس بن جبرؓ

۱۴۔ حضرت سالم مولیٰ ابوحذیفہؓ

۱۵۔ حضرت مسطح بن اثاثہؓ

۱۶۔ حضرت عکاشہ بن محصنؓ

۱۷۔ حضرت مسعود بن ربیعؓ

۱۸۔ حضرت ابوہریرہ دوسیؓ

۱۹۔ حضرت ثوبانؓ مولیٰ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۰۔ حضرت عمیر بن عوفؓ

۲۱۔ حضرت عویم بن ساعدہؓ

۲۲۔ حضرت ابو لبابہؓ

۲۳۔ حضرت ابوالبشر کعب بن عدیؓ

۲۴۔ حضرت خبیب بن سیافؓ

۲۵۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

۲۶۔ حضرت عتبہ بن مسعودؓ

۲۷۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نکاح سے پہلے اہلِ صفہ کے ساتھ رہتے تھے اور انہی کے ساتھ مسجد میں شب گزارتے تھے۔

۲۸۔ حضرت سلمان فارسیؓ

۲۹۔ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ

۳۰۔ حضرت عبداللہ بن زید جہنیؓ

۳۱۔ حضرت حجاج بن عمرو اسلمیؓ

۳۲۔ حضرت معاذ بن الحارثؓ

۳۳۔ حضرت سائب بن خلاد

حضرت ابوذر غفاریؓ مسجد نبوی میں رات دن عبادت میں مشغول رہتے۔ انہوں نے دنیا کی ہر چیز سے منہ موڑ لیا تھا۔ اللہ سے دل لگا لیا تھا۔ جب رات ہو جاتی تو اصحابِ رسولؐ کے ساتھ مسجد میں رات گزار دیتے جن کا کوئی گھر بار نہ تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عشائیہ کے وقت انہیں بلاتے اور اپنے ساتھ کھانا کھلاتے۔

ابوذر غفاریؓ ان لوگوں میں سے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھایا کرتے تھے۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض ہی سے ابوذر غفاریؓ نے دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان پائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا اسے محفوظ رکھا۔ پڑھا لکھا، حفظ کیا، حدیث حاصل کی اور حدیث کی روایت کی۔ آپ بڑے محدثین سے تھے۔ زہد و عبادت میں رسولؐ اللہ کی پوری پوری پیروی کرتے لہذا آپ مشہور ترین زاہد ہو گئے۔
ایک رات ابوذرؓ مسجد کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ داخل ہوئے۔ ابوذرؓ کو تنہا بیٹھے دیکھ کر فرمایا۔
"ابوذرؓ تنہا بیٹھے ہو۔"
ابوذرؓ بولے۔ "نیک ساتھی تنہائی سے بہتر ہے اور برے ساتھی سے تنہائی بہتر ہے۔"
اسی اثنا میں حضرت بلالؓ نے مغرب کی اذان دی۔ لوگ مسجد میں آنے لگے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی نماز کے لیے نکلے۔ جب نماز ہو چکی تو ذکر و فکر کرنے والوں کے حلقے بن گئے اور کچھ رسول اللہ کی باتیں سننے بیٹھ گئے۔
نماز عشاء کے بعد لوگ مسجد سے لوٹ آئے۔ صرف اہل صفہ رہ گئے۔ رسول مقبولؐ کاشانۂ نبوت میں تشریف لے گئے اور اصحاب صفہ سو گئے۔ جب آدھی رات گزر گئی تو رسالت مآبؐ مسجد میں تشریف لائے اور ابوہریرہؓ سے کہا۔
"میرے اصحاب کو بلاؤ۔"
حضرت ابوہریرہؓ نے سونے والوں کو جگایا۔ ان میں حضرت ابوذر غفاریؓ بھی تھے۔ حضورؐ جو کا سالن اور کچھ روٹیاں لائے تھے۔ فرمایا۔
"بسم اللہ کر کے کھاؤ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے آج آل محمدؐ کو اس کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوا۔"
اصحاب صفہ نے کھانا کھایا اور پھر سو گئے۔ ابوذرؓ بھی آنکھیں موندے پڑے تھے کہ نیند آئے اور سو جائیں۔ اچانک آپ نے کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سنی تو چونک گئے۔ رسول اللہ مسجد میں آ رہے تھے۔ ابوذرؓ بڑے غور سے دیکھنے لگے۔ حضورؐ قبلہ رو کھڑے ہو گئے اور نماز

شروع کر دی۔ ابوذرؓ نے اُدھر کان لگا دیئے تو حضورؐ کو یہ آیت پڑھتے سُنا۔

ان تعذبھم فانھم عبادك وان تغفر لھم فانك انت العزیز الحکیم۔

اگر تو انہیں عذاب میں مبتلا کرے تو وہ تیرے بندے ہیں اور بخش دے تو تو ہی غالب ہے حکمت والا ہے۔

ابوذرؓ برابر غور سے دیکھتے رہے۔ حضور پر نورؐ ساری رات رکوع و سجود میں رہے حتیٰ کہ سویرا ہو گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو ابوذرؓ آگے بڑھے اور عرض کی۔

"یا رسول اللہؐ! آپ ساری رات رکوع و سجود میں مشغول رہے ہیں"۔

آپؐ نے فرمایا۔

"میں نے اپنے پروردگار سے شفاعت کی درخواست کی تھی جو اللہ نے مجھے عطا کر دی ان شاء اللہ مجھے حق شفاعت ضرور ملے گا"۔

صفہ پہلی جامعہ اسلامیہ تھی جہاں تعلیم نبوی نے غلاموں کو اس قابل بنا دیا کہ ان کی ٹھوکروں نے جابر و قاہر شہنشاہوں اور سلطانوں کے تاج اُچھالے۔ یہی وہ پہلی جامعہ انسانیہ تھی جس نے ظلمت و ذلت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی انسانیت کو عظمتوں اور رفعتوں سے آشنا کیا۔ گمراہی و بے دینی کے گھور اندھیروں میں سسکتی ہوئی سرزمین حجاز کو بقعۂ نور بنا دیا۔ جس سے پڑھ کر نکلے ہوئے ائمہ فکر نے انسانوں پر فکر و تدبر کی نئی راہیں کھولیں۔

تعلیمِ نبویؐ

مراتب زہد میں سب سے پہلے جس جذبہ کو دبانا چاہیئے وہ محبت دُنیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت کے ساتھ حضرت ابوذرؓ کے سامنے دھن دولت کی مذمت فرماتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کے وقت حضورؐ صحرائے مدینہ میں سیر و تفریح کے لیے تشریف لے گئے —— میں آپؐ کے ساتھ تھا۔ سامنے جبلِ اُحد نظر آیا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے پکارا۔

"ابوذر"

"لبیک یارسول اللہؐ" کہتے ہوئے ابوذرؓ قریب آئے۔

آپؐ نے فرمایا۔

"اے ابوذرؓ! اگر اس اُحد کے برابر بھی ہمارے پاس سونا ہو تو میں اس کو بالکل پسند نہیں کروں گا کہ وہ ہمارے پاس تیسرے دن تک رہ جائے لیکن صرف اس قدر مقدار میں جو قرض داروں کے لیے رکھ دیا جائے۔ میں سب کو ادھر ادھر اللہ کے بندوں میں تقسیم کر دوں"۔

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ ہم پھر آگے چلے۔ آپؐ نے تھوڑی دیر کے بعد پھر ارشاد فرمایا۔ "وہی بے دولت ہیں جو دولت والے ہیں"۔ اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا۔

"خدا ظالم دولت مند کو جو اپنی دولت کو حاجت مندوں میں صرف نہ کرتا ہو پسند نہیں کرتا۔ خدا کی دی ہوئی دولت میں سے اگر حاجت مندوں کو کچھ

نہ دیا تو اُس نے صرف حاجت مندوں پر بلکہ اپنی ذات پر بھی ظلم کیا۔"

حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ایک درخت کے سائے میں نزول اجلال فرمایا۔ میں ذرا فاصلے پر تھا۔ جب قریب ہوا تو فرمانے لگے۔

"ھم الاخسرون ورب الکعبۃ۔ ھم الاخسرون ورب الکعبۃ"۔

"وہی برباد و تباہ ہیں قسم ہے کعبہ کے رب کی، وہی برباد و تباہ ہیں قسم ہے کعبہ کے رب کی۔"

حضرت ابوذرؓ کو خیال ہوا کہ حضورؐ شاید میرے متعلق فرما رہے ہیں۔ کوئی وحی نازل ہوئی ہے۔

حضرت ابوذرؓ کی سانس پھول گئی۔ دوڑ کر قریب آئے۔ عرض کیا۔

"مَن ھم فداك ابی و اُمّی"۔

"وہ کون ہیں آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"الاکثرون اموالًا الا من قال ھٰکذا و ھٰکذا و قلیل ما ھم"۔

"زیادہ مال دولت والے لیکن جس نے اس طرح اور اس طرح دیا وہ بہت تھوڑے ہیں"۔

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں۔ حضورؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اوک بنائی اور دائیں بائیں اشارہ فرمایا۔ یعنی جو مٹھیاں بھر بھر کر دیتے ہوئے غریبوں کی حاجت روائی کرے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو لوگ اونٹوں، بکریوں اور گائیوں کے مالک ہیں اور ان کی زکوٰۃ نہیں دیتے، قیامت کے دن ان کے مویشی بہت بڑے موٹے ہو کر آئیں گے اور جب تک اعمال کا فیصلہ نہ ہوگا کوئی اپنے مالک کو سینگوں سے مارے گا

کوئی اپنے سموں سے کچلے گا۔ ایک قطار جب ختم ہو جائے گی تو دوسری آئے گی اور وہی درگت بنائے گی۔" (مسند احمد)

حضرت ابوذرؓ یہ حدیث تو آخر میں اکثر پڑھا کرتے تھے کہ مجھ سے میرے محبوب نے عہد لیا کہ جس نے سونے چاندی پر گرہ لگائی وہ ان کے مالک پر انگارے ہیں اور نہ صرف یہ حدیث بلکہ ایسے سینکڑوں اقوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابوذرؓ سے کتب احادیث میں موجود ہیں۔ جن میں حضرت ابوذرؓ کی تعلیم کا خصوصیت کے ساتھ پتہ چلتا ہے۔

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں داخل ہوئے اور ارشاد فرمایا۔

"ابوذر! مسجد میں جو سب سے زیادہ بلند رتبہ آدمی ہو دیکھو وہ کون ہے؟"

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو جس کے بدن پر نہایت قیمتی جوڑا دیکھا اور اشارہ کیا کہ حضورؐ وہ رہا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اچھا اب دیکھو ان میں سب سے زیادہ گرا ہوا کون ہے؟

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک مسکین کی طرف جو نہایت پھٹے پرانے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا تھا، اشارہ کیا۔ سرور کائناتؐ نے فرمایا۔

"خدا کی قسم! قیامت کے دن پھٹے پرانے کپڑوں والے کا وزن نیکی اور بھلائی میں قیمتی حُلّے والوں سے تمام زمین کے وزن کے برابر زیادہ ہوگا۔"

حضرت ابوذرؓ ایک دن معاش سے تنگ آکر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور درخواست کی کہ حضورؐ مجھے کسی صوبہ کا عامل مقرر فرمائیں۔

آپ صلوات اللہ علیہ وسلامہ نے سنتے ہی فرمایا۔

"یا اباذر انی اراك ضعیفا وانی احب لك ما احب لنفسی لا تامرن علی اثنین ولا تولین مال الیتیم۔

"ابوذر میں تم کو کمزور پاتا ہوں (یعنی یہ کام تمہاری فطرت کے مناسب نہیں) اور میں تمہارے لیے اسی بات کو پسند کرتا ہوں جو مجھے اپنے لیے پسند ہے ہرگز ہرگز تم دو آدمیوں کے کبھی امیر نہ بننا اور نہ کسی یتیم کے مال کے متولی ہونا۔"

حُبِّ مال جو حُبِّ دنیا کی نہایت خار دار شاخ ہے۔ اس کی نشوونما میں سب سے زیادہ تقویت دینے والی چیز دنیوی ترقی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ کو اس کا بھی علاج بتا دیا تھا اور وہ آخری دم تک اسی پر عامل رہے۔ خود حضرت ابوذرؓ راوی ہیں۔

"میرے خلیل (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے حکم دیا ہے کہ مسکینوں سے محبت کروں۔ اپنے سے کم رتبہ والے آدمی پر ہمیشہ نظر کروں اور اپنے سے بلند مرتبہ پر کبھی نگاہ نہ ڈالوں۔"

حضرت ابوذرؓ میں جو کمال پیدا ہو چکا تھا وہ زہد و تقویٰ کا کمال تھا۔ ڈر تھا کہیں اُن پر خود بینی و خود نگری کا غلبہ نہ ہو جائے۔ جس سے ہوس جاہ و حشم کا سیلاب آخرت کے چین کو بھی بہا کر لے جاتا ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل از وقت اس کا بھی انسداد فرما دیا۔ آپؐ نے ابوذرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"ابوذر! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے میرے بندو! تم سب کے سب گنہگار ہو لیکن جسے میں محفوظ رکھوں۔ پس تم سب کے سب مجھ سے اپنے گناہوں کی بخشش کی درخواست کرتے رہو۔ میں تمہیں بخشوں گا جو مجھے صاحبِ قدرت جانتا ہے کہ گناہوں کو مٹا سکتا ہے اور جس نے میری قدرت کے وسیلہ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہی میں نے اس کے گناہ معاف کئے۔ آپ نے فرمایا تم لوگ گناہوں کا خیال کرتے ہو لیکن نیکیوں کا نہیں۔ عموماً زاہدانہ زندگی گزارنے والے کسب و حرفت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں اور پھر جب اُنہیں دنیوی ضروریات ستاتی ہیں تو حالاً و قالاً بھیک مانگنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔"

حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تم ایک ایسی بات پر بیعت کرو گے کہ اس کے بعد تمہارے لیے صرف جنّت ہے"۔

"جی ہاں"۔ حضرت ابوذرؓ نے کہا اور ہاتھ پھیلا دیئے۔ آپؐ نے فرمایا۔

"ابوذر! میں تم سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں کہ تم کبھی کسی سے کچھ مانگو گے نہیں"۔

حضرت ابوذرؓ نے عہد کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر تمہارا کوڑا بھی گھوڑے سے گر جائے تو تم خود اترو اور خود اسے اٹھاؤ"۔

امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ سے مزید فرمایا۔

"کسی کی نیکی اور بھلائی کو حقیر نہ سمجھو۔ اگر تمہارے پاس کسی کے ساتھ سلوک کرنے کے لیے کچھ نہیں تو اس کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آؤ"۔

یہی وہ تعلیمات نبوی و مواعظ تھے جنہوں نے حضرت ابوذر غفاریؓ میں جذب و مستی پیدا کر دی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان مطہر و اطہر اور قلب مزکّی سے حضرت ابوذرؓ کی زاہدانہ فطرت کو جلا دیتے رہتے تھے۔

زہد و تقویٰ تارک الدنیا ہو کر جنگلوں اور بیابانوں میں نکل جانے کا نام نہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"راستوں سے ہڈیاں اُٹھانا یہ بھی نیکی ہے۔ کسی بھٹکے ہوئے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔ کسی کمزور آدمی کی معاونت کرنا بھی صدقہ ہے"۔

تعلیم و تزکیہ کا یہی زریں سلسلہ تھا جو روز بروز حضرت ابوذرؓ کے اصل جوہر کو چمکا رہا تھا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر لحظ، ہر وقت حضرت ابوذرؓ کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتے تھے۔ ادھر ابوذرؓ کا یہ حال کہ جو کچھ کہا جاتا اور جس وقت کہا جاتا فوراً ان کی روح اُسے جذب کر لیتی۔

شروع شروع میں جب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ایک دن غصہ میں آ کر حضرت بلالؓ کو ان کی غلامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ دیا۔

"یا ابن الامۃ"

"او لونڈی بچے"

حضرت بلالؓ سیدھے دربار نبوت میں پہنچے اور ابوذرؓ کی شکایت کی کہ انہوں نے مجھے گالیاں دی ہیں۔ اسی وقت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی طلبی ہوئی۔ حضورؐ نے فرمایا۔

"اساميت فلانا"

"کیا فلاں (بلال) کے ساتھ تم نے گالی گلوچ کی ہے؟"

زندہ ضمیر ابوذرؓ نے اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"نعم"

"ہاں ایسا ہی ہوا ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ صادر فرمانے سے پہلے پھر دریافت فرمایا۔

"افقلت من امہ"

"کیا تم نے بلال کی ماں کے متعلق کچھ کہا ہے؟"

حضرت ابوذرؓ نے پھر وہی جواب دیا۔

"نعم"

"جی ہاں۔"

حضورؐ نے فرمایا۔

"انك امرئ فيك جاهلية۔"

"تم ایک ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت اب تک موجود ہے۔"

امام بخاری اپنی جامع میں حضرت ابوذرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اپنے ہادی محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے "جاہلیت" کا خطاب پا کر مجذوب ابوذرؓ کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا۔

"على ساعتى هذه من كبر السن۔"

کیا اس وقت بھی اتنی بڑی عمر میں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نعم"

"ہاں"

اور پھر نہایت نرمی اور شفقت سے سمجھانا شروع کیا۔

"ابوذر! تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ کسی کو محض اس کے غلام ہونے کے سبب سے ذلیل نہ سمجھو۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تمہارے سپرد کر دیا ہے۔ چاہیئے کہ انہیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم پہنتے ہو۔

ان پہ اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ وہ مغلوب و عاجز آجائیں اور کبھی بضرورت تم کسی مشکل کام کی تکلیف انہیں دو بھی تو ان کا ہاتھ بٹاؤ۔"

(مسند احمد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ابوذرؓ کے کان میں یہ الفاظ ڈال دیئے تو اس کے بعد دیکھنے والوں نے ان کی طلسمی تاثیر کو دیکھا کہ حضرت ابوذرؓ گھر سے باہر نکلتے تو غلام بھی ساتھ ہوتا۔ جو کپڑے خود پہنتے وہی غلام کو پہنائے ہوتے۔ کئی بار لوگوں نے ٹوکا بھی کہ حضرت جو چادر آپ نے غلام کو دے دی ہے اگر اسے بھی آپ ہی اوڑھتے تو لباس مکمل ہو جاتا۔ آپ اس کا یہ جواب دیتے۔

"اجل ولکن سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اطعموا ھم مما تاکلون والبسوھم مما تلبسون۔"

"ہاں (سچ کہتے ہو) لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپ فرماتے ہیں۔ کھلاؤ اپنے غلاموں کو اسی کھانے میں سے جسے تم کھاتے ہو اور پہناؤ ان کو اسی کپڑے میں سے جسے خود پہنتے ہو۔"

دُنیا نے ہمیشہ اس کیفیت کو جنون و دیوانگی سے تعبیر کیا ہے اور مذہب و مسلکِ تصوف میں ایسے نفوس کو مجاذیب و بہالیل کا خطاب دیا گیا ہے۔

٭ ٭ ٭

حضرت ابوذرؓ کی مجذوبیت

جس طرح آج اسلام کی مختلف شاخیں مختلف اصحاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہیں اسی طرح طائفہ مجاذیب و بہالیل جو فقرا کی مشہور جماعت ہے۔ اس کے سنگ بنیاد اور خشت اوّل قرنِ صحابہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ مجذوبوں کی اصلی حقیقت پر حضرت ابوذرؓ کی سوانح حیات سے پوری روشنی پڑتی ہے۔ ایک معیار ملتا ہے جس پر زمانۂ حال کے مجذوبوں کو جانچا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ حضرت ابوذر غفاری کی وضع اور مجذوبانہ ہیئت ہے۔ طبقات ابنِ سعد، مسند احمد نیز دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بال پریشان رہتے تھے۔ داڑھی بالکل اُلجھی ہوئی رہتی تھی۔ خود اس میں کبھی کنگھی وغیرہ نہ کرتے تھے۔ کوئی آدمی جب آپ کو اس حال میں دیکھتا تو پکڑ لیتا۔ نہلا دھلا کر کپڑے بدل دیتا، بال جھاڑ پونچھ دیتا۔

قبیلہ بنی ثعلبہ کا ایک شخص آپ کی ہیئت کے متعلق راوی ہے۔

"مَرَّبنا شیخ اشعث ابیض الراس و اللحیة فقالوا ھٰذا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسأذناہ ان نغسل راسہ فاذن لنا و استانس بنا۔"

"ایک بوڑھا آدمی ہمارے سامنے سے گزرا جس کے بال اُلجھے ہوئے پریشان تھے۔ سر اور داڑھی دونوں سفید ہو چکے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ ہم نے یہ سُن کر آپ سے اجازت

مانگی کہ ہم آپ کا سر دھوئیں۔ انہوں نے اجازت دے دی اور ہم سے
مانوس ہو گئے۔"

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ آپ کا حُلیہ بیان کرتے ہیں وہ اس پر متفق ہیں کہ آپ دراز قد اور گھنے بالوں والے تھے لیکن رنگ میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ طبقات میں ایک جگہ ہے کہ آپ کا رنگ گندمی تھا اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ کا رنگ سیاہ تھا۔

حضرت ابوذرؓ کا یہ حال تھا کہ لیٹنے تک کے لیے وہ یہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کہاں لیٹ رہے ہیں۔ کس جگہ لیٹ رہے ہیں۔

نحو کے امام اول حضرت ابوالاسود دوئلی سے مروی ہے کہ ایک دن حضرت ابوذرؓ اپنے ایک تالاب سے کھیتوں کو پانی دے رہے تھے۔ چند مسلمان ادھر سے گزر رہے تھے۔ حضرت ابوذرؓ کو دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ کاش ایسے مقدس بزرگ کے موئے مبارک ہاتھ آجاتے تو کیا اچھا ہوتا۔ آپس میں ایک دُوسرے سے کہنے لگے کہ کوئی ہے جو اس کام کو انجام دے۔ ان میں سے ایک نے اس مہم کا بیڑا اٹھایا۔ وہ تالاب پر پہنچا تو تالاب کا کنارہ ٹوٹ گیا۔ یہ دیکھتے ہی حضرت ابوذر غفاریؓ تالاب کے پاس زمین پر بیٹھ گئے اور پھر بیٹھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا کیچڑ سے بھری ہوئی زمین پر لیٹ گئے اس شخص نے پوچھا۔

"حضرت! یہ آپ یکایک بیٹھ گئے اور بیٹھنے کے بعد لیٹے کیوں؟"

حضرت ابوذرؓ نے فرمایا۔

"اے شخص! مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جب کسی کو غصہ آئے اور کھڑا ہوا ہو تو اسے چاہیئے کہ فوراً بیٹھ جائے کہ اس سے غصہ جاتا رہتا ہے ورنہ پھر لیٹ جائے۔"

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ کو تالاب کا کنارہ توڑنے والے پر غصہ آ گیا تھا۔ اسی لیے آپ بیٹھے لیکن مجذوبانہ غصہ تھا نہ اُترا۔ لیکن محمدی جذب کا اثر تھا کہ جذب کے ساتھ اس کا بھی ہوش باقی تھا کہ ایسے موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا ہدایت تھی۔

اس پر عمل کرتے ہوئے آپ اسی زمین پر لیٹ گئے۔

آپ کوئی خاص لباس نہیں پہنتے تھے۔ جو جس قسم کا کپڑا پہنا دیتا پہن لیتے کبھی کبھی لوگوں نے حلّہ قطریہ کو آپ کے جسم مبارک پر دیکھا جو عرب کے بہترین لباسوں اور کپڑوں میں خیال کیا جاتا تھا اور کبھی نہایت ہی خستہ و شکستہ خرقہ دگودڑی میں پھرتے۔ اگر کوئی کپڑا نہ ملتا تو کمبل ہی اوڑھ کر باہر جاتے۔

ایک دن آپ بدوؤں کا سا کمبل اوڑھے جا رہے تھے۔ کسی نے پوچھا۔

"کیا آپ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہ تھا۔"

آپ نے جواب دیا۔

"ہوتا تو تم اس کو ضرور میرے بدن پر دیکھتے۔"

اس شخص نے کہا۔

"دو دن ہوئے آپ پر میں نے نہایت عمدہ جوڑا دیکھا تھا۔ وہ کیا ہوا؟"

فرمایا۔

"میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کو مجھ سے زیادہ اس کی ضرورت تھی۔ اس لیے اُس کو دے دیا۔"

اس شخص نے کہا۔

"میں تو دیکھتا ہوں آپ کو اس کپڑے کی زیادہ ضرورت ہے جس شخص کے پاس بجز پھٹے پُرانے کمبل کے اور کچھ نہ ہو اس سے زیادہ اور کون محتاج ہو سکتا ہے۔"

حضرت ابوذرؓ یہ سُن کر بڑے برہم ہوئے۔ نہایت کرخت لہجہ میں فرمانے لگے۔

"خدا تجھے بخشے۔ تو نے دُنیا کو عظمت کی نگاہ سے دیکھا۔ کیا میرے جسم پر یہ چادر نہیں گو وہ کمبل ہی کی ہے۔ لیکن ہے تو، اور اس شخص کے پاس تو یہ بھی نہ تھی۔ اے شخص! میرے پاس بکریاں ہیں جن کا میں دودھ پیتا ہوں۔ میرے پاس گدھے ہیں جن پر بازار سے چیزیں خرید کر لاتا ہوں۔

غلام ہیں جو میری خدمت کرتے ہیں۔ کھانے پکانے میں میری مدد کرتے ہیں اور ہاں عید و بقر عید کے لیے ایک عبا بھی میرے پاس ضرورت سے زیادہ ہے۔ پس تم خود ہی انصاف کرو کہ ان نعمتوں سے بڑھ کر بھی کوئی نعمت ہو سکتی ہے بلکہ جو عبا میرے پاس زائد ہے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھ سے اس کا محاسبہ نہ ہو۔" (صحاح زاد المعاد)

آپ سونے، لیٹنے، بیٹھنے کے لیے ٹاٹ استعمال کیا کرتے تھے۔ کسی نے کہا۔

"کوئی نرم گدا اپنے لیے کیوں نہیں بنوا لیتے؟"

ہاتھ اٹھا کر فرمانے لگے۔

"خدایا! دنیا میں تو نے جو چیزیں اپنی مرضی سے عطا کی ہیں، میں ان کے لیے بھی مغفرت کا طلب گار ہوں۔"

حضرت ابوذر غفاریؓ کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ حالت جذب و مستی میں نماز، روزہ یا دیگر شرعی امور سے آزاد ہوں گے، ایسا ہرگز نہیں۔ نماز کی پابندی تو اور بات ہے کوئی یہ بھی ثابت نہیں کر سکتا کہ انہوں نے وقت سے ٹال کر کوئی نماز پڑھی ہو۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی کے ساتھ ان کو وقت پر نماز پڑھنے کی تاکید کی تھی۔

آپ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے کہ کونسا عمل افضل ہے تو آپ فرماتے کہ وقت پر نماز پڑھنا افضل عمل ہے۔

حضرت ابوذرؓ پر اگرچہ جذب کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا لیکن آج تک کسی روایت سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ سے کسی وقت کی نماز چھوٹی ہو۔ حضرت ابوذرؓ میں اثر پذیری کا مادہ زیادہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے تھے ٹھیک اسی طرح اس پر عمل کرتے تھے۔ شادی بھی سنت سمجھتے ہوئے کی لیکن آپ کو اپنی حرم محترمہ کی زیبائش کا کبھی خیال پیدا نہ ہوا۔ اولاً آپ کے نکاح کے لیے صرف عورت شرط تھی۔ اس سے بالکل بحث نہیں تھی کہ وہ کیسی ہو۔ کس رنگ کی ہو۔ مورخین جہاں آپ کی بیوی کا حال لکھتے ہیں وہاں ان کی توصیف ہمیشہ ان لفظوں میں کی جاتی ہے۔

"تحتہ امراۃ محماء"

"حضرت ابوذرؓ کے ساتھ ایک کالی عورت رہتی تھی"۔

عبداللہ بن فراش کعبیؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دن آپ سے کہا بھی کہ آپ نے یہ کیا کالی کلوٹی عورت سے نکاح کیا ہے۔ فرمانے لگے کہ بھائی جس بیوی کی وجہ سے لوگ مجھے ذلیل خیال کریں اسے میں ایسی عورت سے بہتر سمجھتا ہوں جس کی وجہ سے لوگوں میں میری خاص وقعت ہو کہ یہ وہ شخص ہے جس کی بیوی بڑی حسین ہے۔

بعض مورخین کا بیان ہے کہ آپ کو اپنی بیوی کی آرائش و زیبائش کا کچھ خیال نہ تھا۔ صرف نکاح کر لیا تھا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تھی۔ ابو اسماء الحبی کہتے ہیں کہ میں نے آپ کی بیوی کو ایک دفعہ دیکھا تھا۔ نہ اُن کے کپڑے خوشبو میں بسے ہوئے تھے اور نہ اُن کے بدن پر اور کسی قسم کی زیب و زینت کا نشان تھا۔ (طبقات ابن سعد)

طبقات ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زوجہ محترمہ کے کان میں بالیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اور کسی زیور کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ بالیاں سونے کی تھیں یا چاندی کی یا کسی اور دھات کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے راہبانہ صحرا نوردیوں سے روکا بھی تھا اور اس دُنیا کو ایک گزرگاہ اور راستہ سے تشبیہ دے کر اپنے آپ کو ایک مسافر کی مانند قرار دیا جو کسی چھاؤں کے نیچے تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا ہو۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان دونوں ارشادوں میں عملی تطبیق اس طرح دی تھی کہ آپ جب تک مدینہ منورہ میں رہے زیادہ تر اِدھر اُدھر پڑے رہتے۔ اکثر صفہ میں سوتے اور اس کے بعد آپ جہاں کہیں رہے کمبل کے خیمہ میں رہے۔

شام کے غدار شہر دمشق میں بھی جب تک آپ رہے مشتِ صوف کے جھونپڑے ہی میں رہے۔ اپنے بال بچوں کے ساتھ اسی قسم کے خیموں میں اپنی زندگی گزار دی یہاں تک کہ جس مکان میں آپ نے اپنی آخری سانس پوری کی، اس وقت بھی دیکھنے والوں نے یہی دیکھا کہ صوف کے معمولی خیمہ میں حضرت ابوذرؓ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ (طبری کامل)

اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اے ابوذر جس سونے اور چاندی پر گرہ لگائی گئی وہ اس کے مالک کے لیے انگارے ہیں۔ ادھر تو یہ ارشاد فرمایا اور دوسری طرف حکم دیا کہ بہترین کاموں میں یہ ہے کہ لوگوں کو کثرت سے سلام کیا کرو۔ مہمان کی مہمان نوازی کرو۔ رات کو نمازیں اس وقت پڑھو جب کہ دُنیا کے لوگ سو چکے ہوں۔ ظاہر ہے کہ مہمان نوازی کے لیے ازبس ضروری ہے کہ انسان کے پاس کچھ پس انداختہ ہو۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان دونوں فرمانوں میں اس طرح تطبیق دی تھی کہ آپ کا سالانہ وظیفہ جس وقت بیت المال سے ملتا تو اپنی لونڈی کو لے کر بازار سے سال بھر کا سامان خرید لیتے۔

مجاذیب اور بہالیل کے طائفہ کے ساتھ اور باتیں بھی مخصوص ہیں۔ مثلاً جو آدمی ان کے پاس جائے گا اس پر پہلے بگڑیں گے۔ اسے جھڑکیں گے اگر زیادہ مغلوب الحال ہو جائیں تو گالیاں بھی دیتے ہیں۔

بہر حال حضرت ابوذر غفاریؓ کا جذب چونکہ جذب کامل تھا اس لیے ہذیان وخرافات تو آپ کی زبان سے نہیں نکلتے تھے لیکن بگڑنے اور جھڑکنے کی عادت آپ میں کم وبیش پائی جاتی تھی۔

عوام تو عوام بڑے بڑے جلیل القدر صحابی آپ سے ملنے آتے تو آپ ان پر بگڑتے، اُن سے بھاگتے، اپنے سامنے سے اُٹھا دینے کی کوشش کرتے۔ لیکن چونکہ اس طائفہ کی ان تمام باتوں کو لوگ ان کی مغلوب الحالی پر محمول کرتے ہیں اور آج تک یہ طریقہ دنیا میں مروج ہے۔ اس لیے کسی کو آپ کی باتیں بُری معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ آپ جس قدر بیزاری ظاہر کرتے صحابہ اسی قدر آپ سے لپٹتے۔ آپ انہیں نکالتے لیکن قدر شناسان حقیقت ابوذریؓ اور بھی آپ سے قریب ہوتے۔

ایک دن حضرت ابوموسیٰ اشعری یمن سے آئے۔ جہاں آپ صوبہ دار اور ناظم تھے آپ حضرت ابوذر غفاریؓ سے بھی ملنے کے لیے تشریف لائے۔ حضرت ابوذرؓ کھڑے ہوئے

تھے۔ ابو موسیٰ اشعریؓ پیچھے سے آکر آپ کی کمر سے لپٹ گئے۔

حضرت ابوذرؓ آپ کو دیکھتے ہی بگڑنے لگے مگر وہ کمر سے پلٹے رہے اور کہتے رہے۔

"مرحبا یا اخی"

"مرحبا میرے بھائی۔"

مگر آپ اپنی کمر کو چھوڑاتے ہوئے فرما رہے تھے۔

"الیک عنّی الیک عنّی"

"ہم سے دُور رہو۔ ہم سے دُور رہو۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے کہا۔

"دُور کیوں رہوں گا، تم تو میرے بھائی ہو۔"

حضرت ابوذرؓ نے جواباً کہا۔

"اب تم میرے بھائی نہیں رہے۔ تم سے برادری اس وقت تک تھی جب تک کہ تم کسی صوبہ کے عامل اور ناظم مقرر نہیں ہوئے تھے۔"

الغرض دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر ابوذرؓ راضی ہو گئے۔ آپ کی یہ عادت تھی کہ بگڑنے اور خفا ہونے کے بعد نرم بھی پڑ جاتے تھے۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ جو بحرین کے ناظم اور صوبہ دار تھے، جب وہاں سے آئے تو آپ سے ملنے گئے اور کمر سے لپٹ گئے۔ حسبِ دستور آپ نے ان کو بھی وہی کہا مگر ابو ہریرہ "مرحبا میرے بھائی" کہتے جاتے تھے۔ آخر ابوذرؓ نرم ہوئے اور کہنے لگے۔

"صوبہ داری تو قبول کر لی۔ کہو کوئی اُونچی کوٹھی بھی تم نے بنوائی۔ کوئی بڑی زمینداری بھی حاصل کی۔ اونٹوں اور بکریوں کے ریوڑ کے بھی تم مالک ہوئے؟"

ابو ہریرہؓ نے کہا۔

"میں نے ان چیزوں میں سے کوئی چیز حاصل نہیں کی۔"

یہ سُن کر خوش ہو گئے اور پھر خود گلے لگا کر فرمانے لگے۔

"ہاں تم میرے بھائی ہو۔ تم میرے بھائی ہو۔"

الغرض عموماً اصحاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر ناز کرتے۔ آپ کی ناز برداریوں میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ آپ ہر شخص کو ڈانٹ دیتے تھے۔ ذرا سی غلطی پر ٹوک دیتے۔ کسی سے نہ ڈرتے اور نہ کسی سے دبتے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شمار جلیل القدر صحابیوں میں ہے۔ ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ ان کے سامنے سے گزر رہے تھے اور وہ اپنے مکان کی تعمیر کرا رہے تھے۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا۔

"آخر تم نے بھی پتھر کی چٹانیں لوگوں کے کندھوں پر لدوائیں۔"

حضرت ابودرداؓ بولے۔

"بھائی میں تو ایک مکان بنوا رہا ہوں۔"

مگر حضرت ابوذر غفاریؓ فقرہ بالا ہی دہراتے رہے۔ حضرت ابودرداؓ نے کہا۔

"شاید آپ کو میرا مکان بنوانا ناگوار ہوا۔"

حضرت ابوذرؓ بولے۔

"ابو درداء کاش میں تمہارے سامنے سے گزرتا اور تم کو اپنے گھر کی غلاظتوں پر پاتا۔ یہ اس سے زیادہ پسندیدہ تھا جس حال میں تم کو اس وقت پا رہا ہوں۔"

حضرت ابوذر غفاریؓ کی حضرت ابوہریرہؓ سے ایک دن ملاقات ہوئی۔ ابوہریرہؓ کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی جس کے قبضہ پر چاندی چڑھی ہوئی تھی۔ حضرت ابوذرؓ یہ دیکھ کر بولے۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔ جس نے پیلے یا سفید (سونا چاندی) کو چھوڑا، ان ہی سے قیامت میں داغا جائے گا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مطلب سمجھ گئے۔ اسی وقت تلوار ہاتھ سے پھینک دی۔

(بیہقی صـ ۱۲۴)

حضرت ابودرداءؓ جن پر حضرت ابوذرؓ اتنے بگڑے تھے، آپ سے اس قدر

عقیدت و ارادت رکھتے تھے کہ جب ان کو خبر ہوئی ابوذرؓ ربذہ چلے گئے تو فرمایا۔

" اگر ابوذرؓ میرے جسم کی بوٹیاں بھی اڑا دیتے تو میں ان کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔"

اس سے حضرت ابوذر غفاریؓ کی عظمت و رفعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

امارت وردافت

حضرت ابوذر غفاریؓ کا اقتدار و اعزاز روز بروز دربار نبویؐ میں بڑھ رہا تھا۔ حتیٰ کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ ذات الرقاع میں تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ کا امام حضرت ابوذر غفاریؓ ہی کو بنایا۔ اور نہ صرف آپ ہی امیر ہوئے بلکہ آپ کے صدقے میں غفاریوں کو بھی کبھی کبھی یہ عہدہ ملا۔ مثلاً غزوۂ دومۃ الجندل کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سباع بن عرفطہ الغفاری کو مدینہ کا امیر مقرر فرمایا تھا۔
غزوہ ذات الرقاع یعنی لیتوں والی لڑائی —— وجہ یہ تھی کہ راستہ نہایت سنگلاخ اور پتھریلا تھا۔ جس سے اکثر مجاہدان دین کے پاؤں پھٹ گئے تھے۔ اور انہوں نے پاؤں میں لتے باندھ لیے تھے۔ چونکہ ذات الرقاع صحیح روایات کی بنا پر خندق کے بعد واقع ہوا ہے۔ اس لیے حضرت ابوذرؓ کا امیرِ مدینہ ہونا کوئی بعید بات نہیں۔
(زاد المعاد۔ ج ۱، ص ۱۲)

ردافت

عرب میں عام طور سے دستور تھا کہ جب اونٹ پر سوار ہوتے تو اپنے کسی خاص آدمی کو اپنا ردیف بنا لیتے تھے جو سوار کی کمر تھام کر پیچھے بیٹھتا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی کبھی کسی کو اپنا ردیف بناتے تھے۔ حجۃ الوداع میں آپ کے ردیف آپ کے چچا زاد بھائی فضل بن عباسؓ تھے۔
صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ردافت

ایک بڑا عہدہ جلیل تھا۔ جس کے ساتھ آپ یہ عزت دیتے تھے کہ عموماً وہ ردیف النبی کے لقب سے ملقب کیا جاتا تھا

حضرت ابوذر غفاری بھی اس عزّت سے سرفراز کئے جاتے رہے۔ نہ صرف اونٹوں بلکہ چھوٹی چھوٹی سواریوں پر بھی حضرت ابوذرؓ کو اپنے پیچھے بٹھا لیا کرتے تھے اور آپ سے باتیں کرتے ہوئے راستہ طے فرماتے تھے۔

(زاد المعاد، طبقات ابن سعد۔ مسند احمد)

خدمت

صرف ردافت ہی نہیں بلکہ ایک زمانہ تک حضرت ابوذر غفاریؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم بھی رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی خدمت سے بہت زیادہ خوش تھے ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ آپؐ کی خدمت سے فارغ ہو کر کچھ رات گزرے مسجد نبوی میں سونے کے لیے آئے۔ چونکہ اس دن زیادہ کام تھا اس لیے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دلدہی کے لیے تھوڑی دیر کے بعد مسجد میں تشریف لائے۔

حضرت ابوذرؓ سو چکے تھے۔ آپ نے انگوٹھے کے اشارے سے جگایا۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ آپؐ نے پوچھا۔

"ابوذر کیا ہے۔ اس دن کیا کرو گے جب اس مسجد سے نکالے جاؤ گے"۔

حضرت ابوذرؓ دربار نبوت میں بڑے شوخ تھے، بولے۔

"اپنی تلوار سونت لوں گا اور جو مجھے یہاں سے نکالے گا اس کی گردن اڑا دوں گا"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اُٹھائے اور دُعا کرنے لگے۔

"اے خدایا! ابوذرؓ کی مغفرت فرما"۔

اس کے بعد ابوذرؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔

"ابوذر ایسا نہ کرنا۔ جو بھی تجھ پر حاکم ہو، اگرچہ حبشی غلام کیوں نہ ہو، اس کے ناک، کان اکھڑے کیوں نہ ہوں۔ اگر وہ حق پر ہو اس کی اطاعت کرنا چاہیئے۔"

"اور اگر وہ حق پر نہ ہو میرے آقاؐ؟" ابوذرؓ نے عرض کیا۔

"تو اس کی کوئی اطاعت نہیں۔ اطاعت صرف معروف کی ہے۔ اطاعت صرف معروف کی ہے۔" حضورؐ نے فرمایا۔

اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذرؓ کے ساتھ مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ گئے اور دیر تک راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے۔

صاحبِ سرّ النبیؐ

حضرت ابوذر غفاریؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خاص خصوصیت یہ بھی تھی کہ سرورِ کائناتؐ نے بہت سے اسرار آپ کو بتائے تھے۔ لوگ جب آپ سے کوئی حدیث پوچھتے تو فرماتے۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسرار بتائے ہیں اگر وہ پوچھتے ہو تو نہیں بتاؤں گا۔ اس کے علاوہ جو کچھ پوچھنا ہو پوچھو۔"

(مسند احمد بن حنبل)

حضرت ابوذر غفاریؓ کا یہ حال تھا کہ جب کبھی حدیثِ جاناں کا ذکر فرماتے تو فرماتے۔

"اوصانی حبیبی بثلاث بصلوٰۃ الضحیٰ والوتر قبل النوم والصیام ثلاثۃ ایام من کل شھر۔"

"میرے محبوبؐ نے مجھے تین باتوں کی وصیت کی ہے چاشت کی نماز کی اور وتر سونے سے پہلے پڑھ لیا کروں اور ہر ماہ میں تین روزے رکھنے کی۔"

(مسند احمد بن حنبل مطبوعہ مصر)

اور فرماتے ہیں کہ میں اس کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اسی طرح ایک دوسری وصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اوصانی حبیبی بخمسٍ ارحم المساکین واجالسھم وانظر الیٰ ما ھو تحتی ولا انظر الیٰ ما ھو فوقی وان اصل الرحم وان اقول الحق ولو کان مرًّا وان اقول لا حول

ولا قوۃ الّا باللہ"۔ (مسند احمد)

"میرے محبوبؐ نے مجھے (اور) پانچ باتوں کی وصیت کی، یہ کہ مسکینوں پر مہربانی کروں اور انہیں کے ساتھ نشست و برخاست رکھوں۔ ہمیشہ اپنے سے ابتر حال والوں پر نظر رکھوں اور اپنے سے بہتر حال والے کو نہ دیکھوں اور رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کروں اور سچ بولوں اگرچہ تلخ کیوں نہ ہو اور کہتا رہوں کہ گناہوں سے باز نہیں رہ سکتا اور نہ فرمانبرداری پر قادر ہو سکتا ہوں مگر صرف خدا کی مدد سے۔"

احنف بن قیس راوی ہیں کہ میں نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بیت المقدس کی مسجد میں ایک حدیث بیان کرتے ہوئے دیکھا۔ صرف اتنے الفاظ کہہ کر مجھے میرے حبیب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی اور چیخ مارتے۔ پھر یہی کہتے کہ میرے حبیب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی اور چیخ مارتے حتیٰ کہ چوتھی بار ضبط کر کے آپ نے حدیث بیان کی۔

ایک دن حضرت ابوذرؓ کو خیال گزرا کہ آج تو ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے ہیں لیکن جنت میں کیا ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بہشت میں ہوں گے اور میرا وہاں جانا نہ جانا مشکوک ہے کہ جنت کا استحقاق تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباعِ کامل سے ہوتا ہے اور ہم میں یہ کب ہے۔

الغرض اس کا خلجان اس قدر بڑھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے اور پوچھا۔

"یا رسول اللہ! ایک آدمی ہے جو کسی کو پیار کرتا ہے۔ اس سے اسے محبت ہے لیکن اس میں استطاعت نہیں کہ اپنے محبوب کے مانند تمام اعمال و افعال کو بجالائے پھر اس کا قیامت میں حال کیا ہوگا؟"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذرؓ کے مقصد کو پا گئے تھے۔ فرمایا۔

"اے ابوذرؓ! تم تو اسی کے ساتھ رہو گے جس سے محبت کرتے ہو۔"

دربارِ رسالت میں جب کسی کی زبان نہیں کھلتی تھی ابوذرؓ جو جی میں آتا تھا پوچھتے تھے۔ حضورؐ کے لطف و کرم نے آپ کو گستاخ کر دیا تھا۔ خود فرماتے ہیں۔

"اناکنت اسئال عنھا یعنی اشد مسئلة"

"میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت پوچھا کرتا تھا اور پوچھنے میں سخت تھا۔"

(سنن بیہقی)

صحبت و خدمت کی اس طویل مدت اور سوالوں کی پوچھ گچھ کے اس دراز سلسلے میں شاید ہی کبھی حضرت ابوذرؓ کو بارگاہِ رسالتؐ سے جھڑکی ملی ہو۔ البتہ ایک دفعہ جب ابوذر غفاریؓ اپنے حدود سے بہت آگے بڑھ گئے تو پھر عتاب ہوا اور ایسا عتاب ہوا کہ حضرت ابوذرؓ بھی اس کو ہمیشہ یاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"فغضب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما غضب علیّ من قبل ولا من بعد"

"پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر غصے ہوئے اور اس قدر غضبناک ہوئے کہ نہ اتنا غصہ آپؐ کو مجھ پر اس سے پہلے آیا تھا اور نہ اس کے بعد کبھی آیا۔"

(سنن بیہقی)

قصہ یہ تھا کہ حضرت ابوذرؓ کو "لیلة القدر" کی بڑی تلاش رہتی تھی۔ ایک دن موقع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے لگے کہ یارسول اللہؐ! کیا قدر کی رات صرف رمضان کے مہینے کے ساتھ مخصوص ہے یا دوسرے مہینوں میں بھی واقع ہو سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا۔

"صرف رمضان میں۔"

میں نے عرض کیا۔

"کیا یہ رات محض اس وقت تک رہے گی جب تک اللہ کے پیغمبر ہم میں ہیں یا ان کے بعد بھی اس کا سلسلہ باقی رہتا ہے؟"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نبی کے بعد بھی یہ رات قیامت تک باقی رہے گی"۔

میں نے عرض کیا۔

"آخر رمضان کے کس عشرہ میں اس رات کو تلاش کیا جائے؟"

آپؐ نے فرمایا۔

"آخر عشرہ میں اور اوّل عشرہ میں اسے ڈھونڈو"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد کسی اور سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ لیکن حضرت ابوذرؓ موقع کی تلاش میں رہے۔ حضورؐ ذرا پھر ادھر متوجہ ہوئے تو حضرت ابوذرؓ نے پوچھا۔

"آخر ان دو عشروں میں سے کس عشرہ میں واقع ہوتی ہے؟"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آخر عشرہ میں۔ بس اب کچھ مت پوچھنا"

آپؐ پھر دوسری باتوں میں مشغول ہو گئے۔ مگر ابوذرؓ تاک میں رہے۔ موقع پاتے ہی باوجود ممانعت کے حضرت ابوذرؓ نے پھر سوال کر دیا۔

"اقسمت علیک یا رسول اللہ بحقی علیک تحدثنی فی ایة العشره هی"۔

"حضورؐ پر میرا جو کچھ بھی حق ہے میں اس کی قسم دے کر عرض کرتا ہوں کہ مجھے بتا دیجئے عشرہ کس رات میں واقع ہوتی ہے؟"

بس اب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوذرؓ پر بڑا غصہ آیا۔ بہرحال یہ اُلفت ومحبت کے دائرہ کی باتیں ہیں۔ ان رموز و اسرار تک محب ومحبوب کے سوا کسی دوسرے کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

محدث ابوذرؓ

حضرت ابوذرؓ کے زہد پر غریب فقیر لوگ ان کے معتقد ہو گئے۔ ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے لگے۔ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنتے۔ ابوذرؓ بڑے پایہ کے محدث تھے۔ بڑی فصیح و بلیغ عربی بولتے تھے۔ بڑے متقی مسلمان تھے۔ تمام لوگوں کا قبلہ بن گئے۔

ایک دن مسجد میں بیٹھے تھے۔ ارد گرد لوگ جمع تھے۔ آپ حسب معمول احادیث نبوی بیان کر رہے تھے۔ ایک شخص بولا۔

"کاش میں نبی کو دیکھتا۔"

حضرت ابوذرؓ نے فرمایا۔

"رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری امت میں سب سے زیادہ محبت کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو میرے بعد آئیں گے اور کہیں گے کہ کاش ہم رسول اللہؐ کو دیکھتے چاہے ہماری اولاد اور مال چھن جاتا۔"

حضرت ابوذرؓ نے سلسلہ حدیث جاری رکھا۔ معراج کی بات چھڑ گئی۔ ایک شخص نے دریافت کیا۔

"رسول اللہؐ کو کیسے پہنچایا گیا؟"

حضرت ابوذرؓ نے کہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں ام ہانی کے گھر میں تھا کہ گھر کی چھت کھولی گئی۔ جبریل آئے۔ انہوں نے میرا سینہ چاک کیا۔ آب زمزم سے دھویا۔ پھر ایک طلائی طشت لائے جو حکمت و ایمان سے

لبریز تھا۔ اسے میرے سینے میں لوٹ دیا گیا۔ پھر میرے سینے کو بند کر دیا گیا۔ پھر مجھے آسمان دنیا کی طرف لے گئے۔ جب میں پہلے آسمان پر پہنچا تو جبریل نے آسمان کے داروغہ سے کہا "کھول"۔ اُس نے پوچھا —— "یہ کون ہے؟" جبریل نے کہا "میرے ساتھ محمدؐ ہیں"۔ اُس نے پوچھا۔ "کیا ان کے پاس پیغام بھیجا گیا ہے؟" جبریل نے کہا "ہاں"۔ جب دروازہ کھول دیا گیا تو ہم آسمان دُنیا کی طرف متوجہ ہوئے تو دیکھا ایک شخص بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے دائیں جانب کچھ گروہ بیٹھے ہیں اور بائیں جانب بھی۔ جب وہ دائیں جانب دیکھتا تو ہنستا اور بائیں طرف دیکھتا تو روتا۔ وہ شخص بولا — "آؤ نیک نبی اور صالح فرزند"۔ میں نے جبریل سے پُوچھا —— "یہ کون ہے؟" اس نے کہا — "آدم اور یہ گروہ ان کی اولاد"۔ دائیں جانب جنتی اور بائیں جانب جہنمی۔ دائیں طرف دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں۔ بائیں طرف دیکھتے ہیں تو روتے ہیں"۔

حضرت ابوذرؓ نے جو نظر اٹھائی تو ایک اجنبی شخص دیکھا جسے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آپ نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

اس نے جواب دیا۔

"نافع طائی"۔

کہاں کے رہنے والے ہو؟

"عراق"۔

کیا عبداللہ بن عامر کو جانتے ہو؟

"ہاں"۔

حضرت ابوذرؓ نے فرمایا۔

"وہ میرے ساتھ رہتا تھا اور پڑھا کرتا تھا۔ پھر وہ امارت و ریاست کا

طالب بن گیا۔ جب تم بصرہ جاؤ تو اس سے کہنا۔ میں ابوذرؓ کا فرستادہ ہوں۔ اس نے تمہیں سلام کہا ہے اور کہا ہے۔ ہم کھجور کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں اور اسی طرح زندہ ہیں جیسے تم زندہ ہو۔"

حاضرین میں سے ایک شخص بولا۔

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، مال و اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں۔"

ابوذرؓ نے کہا۔

"بڑا تعجب تو اس شخص پر ہے جو دارِ بقا کی تصدیق کرتا ہے اور دارِ فنا کی کوشش کرتا ہے۔ ہمیں دنیاوی زینت سے کیا تعلق۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ نیک اعمال باقی رہنے والے تیرے پروردگار کے ہاں بہتر ہیں از روئے ثواب کے اور اچھے ہیں از روئے اُمید کے۔"

نافع طائی بصرے پہنچا اور حاکم بصرہ عبداللہ بن عامر کے پاس گیا۔ عبداللہ نے پوچھا۔

"کیوں آئے ہو؟"

نافع نے کہا۔

"میں شام میں تھا۔ ابوذرؓ سے ملا۔ انہوں نے مجھے آپ کے نام ایک پیغام دیا ہے۔"

جونہی عبداللہ بن عامر نے حضرت ابوذر غفاریؓ کا نام سُنا تو اس کا دل خشوع و خضوع سے بھر گیا۔

نافع نے کہا۔

"ابوذرؓ نے آپ کو سلام کہا ہے اور فرمایا ہے۔ میں کھجوریں کھاتا ہوں اور پانی پیتا ہوں اور تیری طرح ہی زندہ ہوں۔"

جب عبداللہ بن عامر نے یہ پیغام سُنا تو بڑا متاثر ہوا اور گریبان میں منہ ڈال کر زار و قطار رونے لگا حتیٰ کہ دامن تر ہو گیا۔

حضرت ابوذرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے تھے ٹھیک اسی طرح اس پہ

عمل کرتے تھے اور دین کے معاملے میں اتنے متشدد تھے کہ دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اگر اس معاملے میں آڑے آجاتی تو آپ اس کی بالکل پروا نہ کرتے۔

خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔

"اب دنیا میں کوئی نہیں رہا جو خدا کی باتوں میں ملامت کرنے والوں کی طعن و تشنیع سے نہ ڈرتا ہو، سوائے ابوذرؓ کے۔"

ظاہر ہے اعمال کی پابندی یقیناً ایک بہت بڑی آزمائش ہے اور شریعت کا اہم مطالبہ ہے۔ صحاح میں ہے کہ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"میری اس رگِ گلو پر تلوار کی دھار بھی رکھ دی جائے اور کسی سچی بات کی تبلیغ مجھ سے رہ گئی ہو تو اسے نافذ کر کے رہوں گا۔"

یہ بھی عموماً آپ بیان کرتے تھے۔

"میرے حبیبؐ نے وصیت کی ہے کہ میں سچ بات کہوں اگرچہ وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو؟"

ظرافت

اب تک حضرت ابوذرؓ کے جتنے حالات بیان ہو چکے ہیں ان سے گماں ہوتا ہے کہ آپ کے مزاج میں خوش طبعی اور ظرافت کا مادہ موجود نہ تھا، ایسا ہرگز نہیں۔ آپ کے مزاج میں ظرافت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ ایک دن آپ کسی مجمع میں بیٹھے تھے۔ فرمانے لگے۔

"مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ایک شخص پیش ہوگا۔ فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ پہلے اس پر اس کے چھوٹے چھوٹے گناہوں کو پیش کرو۔ فرشتے اس کے آگے اس کے چھوٹے گناہوں کی فہرست اس طرح پیش کریں گے کہ تم نے فلاں فلاں دن یہ کیا۔ وہ بیچارا اس کا اقرار کرتا جائے گا اور دل میں ڈرے گا کہ دیکھئے جب کبائر کی فہرست پیش کی جاتی گی تو کیا ہوگا۔ فرشتے جب صغائر پوچھ کر فارغ ہو جائیں گے تو آواز آئے گی کہ اس کو ہر ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی دیتے چلے جاؤ۔ اس رحیمانہ کرم و بخشش پر وہ شخص غل مچانے لگے گا فرشتو ٹھہرو۔ ابھی ہمارے پاس اور بھی بڑے بڑے گناہ ہیں۔ ان کو بھی گن لو۔ میں اس فہرست میں انہیں نہیں دیکھتا۔"

حضرت ابوذرؓ اس لفظ پر آکر ٹھہر جاتے اور فرماتے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ حدیث بیان فرماتے تو بڑا ہی ہنسا کرتے۔ اس کے ساتھ حضرت ابوذرؓ بھی ہنسنے لگتے۔

ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ حضرت ابوذرؓ باب کعبہ کی زنجیر پکڑے ہوئے فرما

رہے ہیں۔

"جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا جان لے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی ابوذرؓ ہوں۔"

پھر فرمایا۔

"جس طرح میں کعبہ کی زنجیر پکڑے ہوئے ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح کعبہ کی زنجیر پکڑ کر یہ فرما رہے تھے۔"

(بحدیث بیہقی)

نعیم بن قعنب الریاحی کہتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت ابوذرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گھر پر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ یہاں تشریف نہیں رکھتے۔ آپ کی بیوی صاحبہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے فرمایا۔

"سامنے ان کی کچھ زمینیں ہیں وہیں ہوں گے۔"

جب میں ادھر چلا تو دیکھتا ہوں آپ کے آگے آگے دو اونٹ ہیں جن کے گلے میں مشکیں پڑی ہوئی ہیں اور آپ انہیں پیچھے سے ہنکاتے چلے آ رہے ہیں۔ میں آگے بڑھ کر آپ سے ملا اور ساتھ ساتھ مکان پر آیا۔ آپ نے مشکیں اُتاریں۔ اس کے بعد مجھ سے دریافت فرمایا۔

"تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"آپ سے ملنے کی مجھے تمنا تھی اور آپ کی ملاقات سے مجھے نفرت بھی تھی۔"

حضرت ابوذرؓ نے فرمایا۔

"یہ دونوں باتیں کیونکر ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔"

نعیم نے کہا۔

"میں نے اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کیا ہے۔ اب مجھے اس کی فکر ہے کہ میرا گناہ معاف ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتا ہے تو اس کی کیا صورت

ہے۔ اس کا کفارہ بھی ہے یا نہیں؟"

نعیم بن قعنب الریاحی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"پس جب دل میں یہ خیال آتا تھا کہ آپ ہی میرے لیے کوئی راستہ پیدا کریں گے۔
اس وقت ولولہ ہوتا تھا کہ آپ سے مل ہی لوں۔ پھر کبھی خطرہ ہوتا تھا
کہ کہیں آپ نے مجھے مایوس کر دیا تو عمر بھر کا غم میرے ساتھ لگا رہے گا اور
یوں مجھے آپ سے نفرت ہو جاتی تھی۔"

حضرت ابوذرؓ نے فرمایا۔

"لڑکیوں کو قتل کرنے حرکت تم نے کفر کے زمانہ میں کی ہے یا اسلام میں؟"

نعیم نے جواب دیا۔

"ایام کفر میں۔"

حضرت ابوذرؓ نے فرمایا۔

"تو پھر کیا پروا ہے۔ اسلام خود ہی تمام گناہوں کا کفارہ ہے۔"

یہ کہتے ہوئے آپ اپنی بیوی سے مخاطب ہوئے اور سر سے کچھ اشارہ کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ مہمان کے لیے کچھ کھانا لاؤ۔ یہ سنتے ہی بیوی صاحبہ برس پڑیں۔

"ایک تو کچھ کماتے نہیں اوپر سے مہمان نوازی کا شوق۔"

آپ نے پھر نہایت نرمی سے کہا۔

"بیچارے کے لیے کچھ لاؤ۔"

لیکن وہ تو بگڑ رہی تھیں۔ آپ نے تیسری بار کچھ زور دے کر فرمایا کہ لاتی ہو یا نہیں۔ لیکن وہ کب سننے والی تھیں۔ اس طرح الجھ پڑیں اور الجھتی رہیں کہ آخر میں آپ نے ہنس کر فرمایا۔

"اری کس قدر بولو گی۔ تم کہیں اس سے بھی آگے نکل سکتی ہو جو حضور تم
لوگوں کی شان میں ارشاد فرما چکے ہیں۔"

نعیم نے کہا۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے بارے میں کیا فرمایا ؟"
حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا۔
"عورتیں ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اگر انہیں سیدھی کرنا چاہو گے تو ٹوٹ جائیں گی اور اگر یوں ہی چھوڑ دو گے تو کجی باقی رہے گی۔ لیکن کچھ کام بھی چلتا رہے گا۔" (مسند احمد)
یہ سن کر وہ اندر تشریف لے گئیں اور خشک ثرید کے کچھ ٹکڑے لے آئیں۔ آپ نے نعیم سے کہا۔
"بس تو شروع کیجئے اور اس کا کچھ خیال نہ کیجئے کہ میں کیوں شریک نہیں ہوا، کیونکہ میں روزہ دار ہوں۔"
یہ کہہ کر نماز کی نیت باندھ لی۔ سلام پھیر کر بیٹھ گئے۔ ہاتھ بڑھا کر ثرید کھانا شروع کیا۔ نعیم نے حیران ہو کر کہا۔
"حضرت! ابھی آپ نے فرمایا تھا میں روزہ دار ہوں۔"
حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا۔
"ہاں۔ بعد اس کھانے کے بھی روزہ دار ہوں۔ کیونکہ اس مہینہ کے تین دنوں ۱۳۔۱۴۔۱۵ میں روزے رکھ چکا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جس نے ان تین دنوں میں روزہ رکھا اس نے گویا مہینے بھر کا روزہ رکھا۔ پس آج میرا روزہ بھی ہے، اس کا اجر بھی ہے اور تمہارے ساتھ کھا بھی رہا ہوں۔"
حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ جب شروع شروع مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیلی آب و ہوا کا حکم دیا کہ جہاں بیت المال کے مویشی چرتے ہیں وہاں چلے جاؤ۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اسی صحرائی علاقے کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ کی حرم محترمہ ساتھ تھیں۔ یہ ایسا علاقہ تھا جہاں پانی کا نام نہ تھا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو دودھ پر ہی گذر کرنا پڑی۔ آب و ہوا کی

تبدیلی سے آپ کی صحت بہتر ہونے لگی۔ یہ شباب کا زمانہ تھا۔ بیوی ساتھ تھیں۔ یہ سوچے بغیر کہ آخر اس وادی میں پانی ملے گا یا نہیں، اپنے اوپر غسل واجب کر لیا۔ حضرت ابوذر کو اس وقت اس کا پتہ نہ تھا کہ پانی میسّر نہ ہو تو تیمّم کیا جا سکتا ہے۔ نماز کے قضا ہونے کا اندیشہ ہوا۔ ایک تیز رفتار اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ پہنچے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بیساختہ نکلا۔

"سُبحان اللہ ابوذر"

"خدا کی شان ابوذر"

حضرت ابوذر نے سارا قصہ بیان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیساختہ ہنسی آ گئی۔

ایک دفعہ آپ کی بیوی صاحبہ نے روزی روزگار کے سلسلہ میں آپ کو مشورہ دیا تو آپ گھر سے نکل کر مجمع عام میں فرمانے لگے۔

"تم لوگ اس کالی کلوٹی کو دیکھتے ہو۔ مجھ سے کہتی ہے عراق جاؤ اور جب میں جاؤں گا تو مسلمان میری طرف روپے پیسے لے کر جھکیں گے لیکن میں کیا کروں میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد لیا ہے کہ پُل صراط کے قریب ایک راستہ ہے جس پر پاؤں پھسل جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں اس پر ہلکا پھُلکا چلوں۔ یہی میرے لیے بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ روپے پیسے کے بوجھ میں لدا ہوا گراں بار ہو کر اسے عبور کر لوں۔"

(طبقات ابنِ سعد)

آپ اپنی بیوی کی فرمائشوں کو ٹال دیتے۔ جو کچھ حلال اور پاکیزہ طریقہ سے آپ کے پاس آتا دے ہی دیتے۔ اس کے بعد نہ ان کی فرمائشوں کی پروا کرتے اور نہ اپنی نفسانی خواہشوں سے متاثر ہوتے کہ یہاں نفس باقی نہ تھا۔ آپ شادی بھی نہ کرتے سنتِ رسُول سمجھ کر کر لی۔

غزوات

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوہ خندق کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔ نبی علیہ السلام کے ساتھ غزوہ بنی لحیان اور غزوہ قرد میں شریک ہوئے۔ ۶ھ میں جب امام الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بنی المصطلق کے لیے نکلے تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا حاکم بنایا۔

نبی علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ سلطنت روم نے ملک شام میں بڑی فوج جمع کی ہے۔ شہنشاہ ہرقل نے اپنی سپاہ کو ایک سال کا خرچ دیا۔ قبیلہ لخم، جذام، عاملہ اور غسان جنگ کے لیے نکلے۔ ہرقل جزیرۂ عرب کے شمالی حصہ پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جہاد کی دعوت دی اور یہ بھی بتا دیا کہ تبوک جانا ہے۔ مدینہ اور شام کے درمیان لمبا سفر تھا۔ لشکرِ اسلام کا تبوک پہنچنے سے پہلے پانی ختم ہو گیا تو لوگ اُتر پڑے۔ پانی کی تلاش کی تو پانی نہ پایا۔ لہٰذا انہوں نے اونٹوں کو ذبح کرنا شروع کر دیا تاکہ ان کے شکموں سے پانی نکال کر پئیں۔ اس موقع پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی تو بادل آ گئے۔ برسنے لگے۔ لشکر میں زندگی کی لہر دَوڑ گئی۔

غزوۂ تبوک سخت قحط کے ایام میں ہوا۔ دُور کا سفر تھا، گرمیوں کا موسم، سواری کم، کھانے پینے کی تکلیف، جیشِ اسلام کی تعداد زیادہ۔ اس لیے اس کو جیش العسرۃ بھی کہتے ہیں۔ منافقوں کو اس میں شرمساری ہوئی تھی۔ ان کا نفاق ظاہر ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کو غزوۂ فاضحہ بھی کہتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رجب ۹ھ میں جمعرات کے روز روانہ ہوئے۔ آپ کو خبر ملی تھی کہ شام میں روم کے شہنشاہ ہرقل نے بڑی فوج جمع کی ہے اور بڑی دولت اس میں تقسیم کی ہے۔ رومنوں کے ساتھ لخم، جذام، عاملہ اور غسان ایسے قبیلے بھی شامل ہو گئے تھے۔ رومی فوج کا مقدمۃ الجیش ارضِ بلقا تک آ گیا تھا۔

اس جنگ کی تیاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغنیا کو فی سبیل اللہ نفقہ و سواری مہیا کرنے کی ترغیب دی۔ تمام صحابہ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اونٹ اور مال لائے۔ عورتوں نے اپنے اپنے زیورات لا کر حاضر کر دیئے۔ کوچ کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد بن مسلمہ انصاری کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو اہلِ بیت کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑا۔ تیس ہزار فوج اور دس ہزار گھوڑوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔

ثنیۃ الوداع میں قیام کیا۔ فوج کا مقدمہ، میمنہ اور میسرہ مرتب کیا۔ آگے بڑھے مقام حجر میں پہنچے جو قوم ثمود کا ملک تھا۔ وہی قوم ثمود جس کی بداعمالیوں سے غضب میں آ کر اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنا عذاب نازل کیا تھا اور اس کو صفحۂ دنیا سے مٹا دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکرِ اسلام سے فرمایا۔

"ان عبرتناک کھنڈروں سے جلدی نکلو۔ یہاں کا پانی نہ پیو اور نہ اس پانی سے وضو کرو۔ جس نے اس پانی سے آٹا گوندھا ہو، اونٹ کو کھلا دے۔"

گرمی کی شدت سے جانور تک پیاس سے بے حال ہو رہے تھے۔ لہٰذا ان کھنڈروں سے کافی دور آگے نکل کر لشکرِ اسلام بیرِ ناقہ کے کنوئیں پر ذرا رُکا۔ لشکر نے خود پانی پیا اور اپنے جانوروں کو بھی پلایا۔

لشکرِ اسلام آگے بڑھا۔ راستے میں حضرت ابوذر غفاری کا اونٹ سُست پڑ گیا اور لشکرِ اسلام سے پیچھے رہ گئے۔ انہوں نے اونٹ کو تیز چلانے کی بڑی کوشش کی لیکن اس کی رفتار میں کچھ فرق نہ آیا۔

آپ نے اونٹ کو وہیں چھوڑا۔ اسباب اپنی پیٹھ پر رکھا اور لشکرِ اسلام کے پیچھے

چل دیئے۔ لشکرِ اسلام نے کافی مسافت طے کر کے ایک اور جگہ قیام کیا تو کسی نے آ کر عرض کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی شخص دور تنہا چلا آ رہا ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ابوذر ہو گا۔"

جب لوگوں نے غور سے دیکھا تو کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! خُدا کی قسم ابوذر ہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"خُدا ابوذر پر رحم کرے۔ وہ تنہا چلے گا۔ تنہا مرے گا۔ تنہا اٹھایا جائے گا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی طرف بڑھے۔ سامنے آئے تو بہت خوش ہوئے۔ فرمایا !

"اے ابوذر ! اللہ نے تیرے ہر قدم کے بدلے تیرا ایک گناہ معاف کر دیا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک بڑھایا۔ سامان ان کی پُشت سے اُتارا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ بھوک، پیاس اور تھکن کی وجہ سے غش کھا کر گر گئے۔ پھر پانی طلب کیا اور پانی پیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ روز تبوک میں قیام کیا۔ رومی لشکر مقابلے میں نہ آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک سے واپس ہوئے تو مقام ذی اوان میں قیام فرمایا۔ اس مقام سے مدینہ ایک گھنٹہ کا راستہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبوک جانے سے پہلے انصار کے بعض لوگوں نے مسجد قبا کے قریب مسجد ضرار بنائی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے کہ ہم نے معذورین کے لیے ایک مسجد بنائی ہے۔ آپ چل کر اس میں نماز پڑھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ابھی میں سفر میں جا رہا ہوں واپس آنے کے بعد تمہاری مسجد میں نماز پڑھوں گا۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے لوٹ کر ذی اوان پہنچے تو آپ پر وحی نازل ہوئی اور اُس مسجد کے بانیوں کی نیت سے آپ کو مطلع کیا۔ آپ نے مالک بن الدخشم اور

معن بن عدی عجلانی کو بلایا اور حکم دیا کہ جاؤ اور ان ظالموں کی مسجد کو گرا دو۔ اور جلا دو۔ لہذا مسجد کو جلایا اور گرا دیا گیا۔

دارمی میں حضرت عباس کی روایت ہے کہ جن لوگوں نے مسجد ضرار بنائی تھی وہ انصار کے چند آدمی تھے، منافق تھے۔ ابو عامر فاسق نے ان سے کہا تھا کہ تم ایک مسجد بناؤ اور جہاں تک ہو سکے اس میں خفیہ طور پر اسلحہ جمع کرو۔ میں قیصر روم کے پاس جاتا ہوں وہاں سے ایک فوج لاؤں گا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحاب کو مدینہ سے نکال دوں گا۔

جن منافقین نے مسجد ضرار بنائی تھی وہ بارہ آدمی تھے۔ اُن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ جذام بن خالد
۲۔ ثعلبہ بن حاطب
۳۔ معتب بن قیشرین
۴۔ ابو حبیبہ ابن الازعر
۵۔ عباد بن حنیف
۶۔ جاریۃ بن عامر
۷۔ مجمع بن جاریہ
۸۔ زید بن جاریہ
۹۔ نبتل بن الحارث
۱۰۔ بحزج
۱۱۔ بجاد بن عثمان
۱۲۔ ودیعہ بن ثابت

ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ مدینہ سے تبوک تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور مسجدیں یہ تھیں۔

۱۔ مسجد تبوک

۲۔ مسجد ثنیۃ مدران

۳۔ مسجد ذات الزراب

۴۔ مسجد بالاخضر

۵۔ مسجد بالشق

۶۔ مسجد ذی الجیفہ

۷۔ مسجد بصدر حوضی

۸۔ مسجد بالحجر

۹۔ مسجد بالصعید

۱۰۔ مسجد وادی القریٰ

۱۱۔ مسجد بالرقعہ

۱۲۔ مسجد ذی المروہ

۱۳۔ مسجد فیضا

۱۴۔ مسجد ذی خشب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ کے قریب آئے تو اشتیاق میں عورتیں بچے سب استقبال کے لیئے نکل پڑے۔ حضور جب مدینہ میں داخل ہوئے تو فرمایا۔

"ھٰذا طابہ وھٰذا جبل اُحد یحبنا و نحبہٗ۔"

"یہ طابہ ہے اور جبلِ اُحد کو میں پیارا ہوں اور جبلِ اُحد مجھ کو پیارا ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے مسجد میں تشریف لائے۔ دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد وہ لوگ آئے جو غزوہ تبوک میں شریک نہ ہوئے تھے اور عدم شرکت کے عذرات پیش کئے۔

حجۃ الوداع

حجۃ الوداع رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج تھا اور ہجرت کے بعد یہی آپ کا پہلا حج بھی تھا۔ بعض اس حج کو حجۃ الاسلام کے نام سے پکارتے ہیں اور بعض اسے حجۃ البلاغ کا نام دیتے ہیں۔

جس زمانے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ یمن سے واپس آنے کی تیاری کر رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کی تیاری میں مصروف تھے اور آپ نے دوسرے مسلمانوں کو بھی اس غرض کے لیے تیاری کا حکم دے دیا تھا۔ قبل ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو مرتبہ عُمرہ کر کے حج اصغر تو بجا لا چکے تھے لیکن حج اکبر کی ادائیگی کا اب تک موقع نہ آیا تھا۔ اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر یہ امر بھی تھا کہ خود بہ نفسِ نفیس مسلمانوں کو ارکانِ حج سے آگاہ کریں۔

جونہی یہ خبر قبائل میں پھیلی اور ساتھ ہی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لوگوں تک پہنچا کہ انہیں بھی اس سال اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ فریضہ حج ادا کرنا چاہیئے تمام جزیرہ عرب میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ پہاڑوں، وادیوں، صحراؤں اور میدانوں سے مدینہ کا رُخ کرنے لگے۔

مدینہ کے ارد گرد خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا۔ جس میں ایک لاکھ سے زیادہ ایسے افراد سکونت پذیر تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آپ کے ہمراہ فریضہ حج کی ادائیگی کو جمع ہوئے تھے۔

۲۵۔ ذوالقعدہ سنہ ۱۰ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام ازواج مطہرات کے

ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ اس قافلہ حجاز میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بھی شریک سفر تھے۔ آپ کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جو اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کے شوق میں مدینہ میں جمع ہوتے تھے۔ بعض مورخین نے ان کی تعداد نوے ہزار اور بعض نے ایک لاکھ چودہ ہزار لکھی ہے۔

جب یہ عظیم الشان کاروانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ذوالحلیفہ پہنچا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ چنانچہ رات ذوالحلیفہ میں گزاری۔ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اہلِ قافلہ نے احرام باندھا اور امیر و غریب سب کے سب ایک لباس میں ملبوس ہو گئے۔ جو محض ایک تہ بند اور ایک چادر پر مشتمل تھا۔ جب یہ قافلہ سرف پہنچا جو مکہ اور مدینہ کے درمیانی راستہ پر واقع ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا۔

"تم میں سے جس کے پاس قربانی کے جانور نہیں ہیں وہ عمرہ کی نیت کر لے۔ اور جس کے پاس قربانی کا جانور ہے وہ حج کی نیت کر لے، اس کے لیے عمرہ کی نیت جائز نہیں ہے۔"

۴۔ ذی الحجہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہیوں کے ہمراہ مکہ پہنچے اور سیدھے خانہ کعبہ گئے وہاں آپ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔ اس کے بعد مقام ابراہیم پر نماز پڑھی۔ دوبارہ حجر اسود کو بوسہ دیا۔ پھر صفا پر تشریف لائے اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ اس کے بعد آپ نے اعلان کر دیا کہ جس شخص کے ساتھ قربانی کا جانور نہ ہو احرام کھول دے۔ بعض لوگوں نے تردد کیا۔ جس پر حضور علیہ السلام کو سخت غصہ آیا۔ فرمایا۔

"میں حکم دے رہا ہوں اسے بجا لاؤ۔"

اسی حالت میں آپ اپنے خیمے میں آئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کے چہرے پر برہمی کے آثار کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

آپ نے فرمایا۔

"مجھے غصہ نہ آئے تو اور کیا ہو۔ میں لوگوں کو حکم دیتا ہوں لیکن وہ اس کی تعمیل نہیں کرتے۔"

جب مسلمانوں کو علم ہوا کہ حکم عدولی کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ناراض ہو گئے ہیں تو انہیں بے حد افسوس ہوا۔ اور جن لوگوں کے پاس قربانی کے جانور نہ تھے انہوں نے فوراً احرام کھول دیئے۔ آپ کی ازواج مطہرات اور بیٹی سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہن نے بھی احرام کھول دیا۔ صرف ان لوگوں کے احرام باقی رہے جو اپنے ساتھ قربانی کے جانور لائے تھے۔

ذی الحجہ کو ترویہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے منیٰ تشریف لے گئے اور وہاں ایک خیمہ میں فروکش ہوئے۔ جو آپ کے ارشاد کے بموجب عرفات کے مشرقی جانب نمرہ بستی کے قریب نصب کیا گیا تھا۔

دن کی نمازیں آپ نے وہیں ادا کیں۔ رات خیمہ میں گزاری اور اگلے روز صبح کی نماز پڑھ کر اپنی اونٹنی قصوا پر سوار ہوئے جس کی مہاریں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھیں۔ آپ نے جبلِ عرفات کا رُخ کیا۔ جب آپ پہاڑی پر چڑھے تو آپ کے گرد لاکھوں مسلمانوں کا مجمع تھا۔ جو بڑے خشوع وخضوع سے تکبیریں پڑھ رہے تھے۔

"لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ۔"

زوالِ شمس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصوا اونٹنی پر سوار ہوئے جس کی مہار اب بھی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ عرفات کے وسط میں تشریف لائے اور اونٹنی پر ہی بیٹھے ہوئے بلند آواز سے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جو انسانیت کا منشورِ اعظم ہے۔

خطبہ کا یہ طریق تھا کہ آپ ایک فقرہ ارشاد فرما کر چُپ ہو جاتے اور ربیعہ بن اُمیّہ بن خلف اسی فقرہ کو بآوازِ بلند دہراتے۔ پھر دوسرا فقرہ ارشاد فرماتے اور ربیعہ بن اُمیّہ اسے دہراتے۔ اس طرح تمام مجمع نے نہ صرف یہ کہ آپ کا تمام خطبہ اچھی طرح سُن لیا بلکہ

اسے ذہن نشین بھی کر لیا۔ آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔

"آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کر لیا۔" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۳)

اسی خطبے میں حضور علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔

"لوگو! شاید یہ میرا آخری حج ہو اور آئندہ سال تم مجھے یہاں اپنے درمیان نہ دیکھو۔"

یہ سنتے ہی لوگ زار زار رونے لگے۔ وہ حضور علیہ السلام کا مطلب سمجھ گئے تھے۔

وصالِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

حجۃ الوداع کے بعد ابوذر رضی اللہ عنہ مکہ سے لوٹے تو بڑے متفکر تھے۔ اُن کے کانوں میں حضور علیہ السلام کے الفاظ ابھی تک گونج رہے تھے۔

"آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور میں نے تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کیا۔"

یہ خیال آتے ہی آپ بڑے غمگین ہو جاتے کیونکہ آپ کو یقین ہو چکا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسالت کو پورا کر چکے ہیں اور اب تھوڑا ہی وقت رہ گیا ہے۔ وصالِ پیغمبر قریب ہے۔

اب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم دو مرتبہ بیمار ہوئے تھے۔ پہلی مرتبہ ۶ھ میں بھوک کے باعث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ناساز ہوئی تھی اور دُوسری مرتبہ ۷ھ میں جبکہ ایک یہودی عورت نے آپ کو گوشت میں زہر ملا کر کھلا دیا تھا اور علاج کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فصد کھلوانی پڑی۔

اور پھر حجۃ الوداع کے بعد آپ اچانک صاحبِ فراش ہو گئے۔ صحابہ کی بے چینی اور بے قراری کی کوئی حد نہ رہی۔ یہی وجہ تھی کہ شام جانے والے لشکر کی روانگی ملتوی کر دی گئی اور اہلِ مدینہ دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ انتظار کرنے لگے کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

ایک دن بیماری ہی کی حالت میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ابوذر کو بلاؤ۔ جب

ابوذر رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے تھے ضعف سے اُٹھ نہ سکتے تھے۔ ابوذر آپ کی طرف جھکے۔ اس وقت آپ کے دونوں ہاتھ بڑھے اور اپنے صدرِ منشرح سے چمٹا لیا۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کا پورا علم ابوذر رضی اللہ عنہ کو ہو گا۔ تاہم اتنا تو دُنیا کو بھی معلوم ہوا کہ اس کے بعد ابوذر رضی اللہ عنہ سے پندار و خودی، آرزو و خواہش ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ ابوذر پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے شرف انسانیت کی مہر ثبت کر دی۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اپنی ساری مجذوبانہ زندگی اسی شرف انسانیت سے گزاری۔ اپنی ساری زندگی اسلامی مساواتِ انسانی کی تبلیغ و اشاعت میں بسر کی کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر سوائے تقویٰ کے۔ اسلام انسانیت کی برتری اور فضیلت کا علمبردار ہے۔ نسل و خون سے وابستہ تصوّر غلط ہے۔ اس غلط احساسِ عظمت اور ناقص تصوّرِ شرف نے دنیا کو ذبح خانہ بنا رکھا ہے۔ اس پہلو کو واضح کرنے کے بعد قرآن حکیم شرف انسانی کا وہ مثبت تصوّر بھی دیتا ہے جس سے اس کی صحیح حیثیت اور صحیح مقام کا تعین ہوتا ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان اول و آخر انسان ہے اور انسان رہنے ہی میں اس کی عظمت ہے۔ اگر وہ انسانی مرتبہ کو پہچانے تو خدا کے بعد کائنات کی اعلیٰ ترین مخلوق ہے اور ابوذر رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ کو پہچان لیا تھا جبکہ یہ سب صحبت و قربت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیضان تھا۔

مسلک ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک اسلامی درس گاہ صُفّہ کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ جو غریب و محتاج مسلمان ہوتے تھے اس میں داخل ہو جاتے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ عام مسلمان ان غریب و محتاج مسلمانوں کی مدد کرتے اور کھانے پینے کا سامان حسبِ حیثیت دیا کرتے۔ اتفاق سے ایک صاحبِ صفّہ کا انتقال ہو گیا۔ غسل دینے کے لیے جب ان کا کپڑا اُتار اگیا تو اس میں سے ایک اشرفی برآمد ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا۔ ایک داغنے والا آلہ ہے۔ اس کے بعد ایک اور صاحبِ صُفّہ کا انتقال ہوا تو ان کے کپڑے سے دو اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ آپ نے ان کو دیکھ کر فرمایا۔ یہ داغنے کے دو آلے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ محدثین و شراح حدیث اس کی وجہ بیان کرتے ہیں صُفّہ کے طالب علم عموماً لوگوں پہ اپنی مسکنت اور غربت ظاہر کرتے تھے۔ لیکن مرنے کے بعد ان کے پاس سے اشرفیاں برآمد ہوئیں تو ان کی ریاکاری ثابت ہوئی باوجود ثروت کے یہ اصحابِ صفّہ میں شریک ہو گئے تھے جو محض مسکینوں کی جماعت تھی۔ خطرہ تھا کہ جب لوگوں کو یہ علم ہو جائے گا کہ صفّہ والوں کے پاس اشرفیاں رہتی ہیں تو مستحق اصحابِ صفہ بھی امداد سے محروم ہو جائیں گے۔

ہر رسول اور نبی نے اپنی امت سے فرمایا :

اَطِیعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیعُونِ (القرآن)

"لوگو! اللہ کا حکم مانو اور اسے میرے عمل کے مطابق انجام دو۔"

دُنیا کا ہر کام اور عمل اگر اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ہے تو بس اس میں اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے اور اگر حکم اور عمل کے خلاف ہے تو یہ اللہ کا غضب اور اس کی ناراضگی ہے۔ اس کے علاوہ نہ کسی دُوسرے کے حکم میں نہ اس کی رضا ہے اور نہ خوشنودی ہے بلکہ ناراضی ہے۔

اسلام کے اعتقادی، سیاسی اور اسلام کے اقتصادی اور قصاصی، اسلام کے حلال و حرام اور خاندانی قوانین کے مطابق کسی فرد یا کسی حکمران کا چلنا اللہ تعالیٰ کی رضا میں شامل ہے۔

قرآن حکیم کی سورۃ کہف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے رسول! حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ زمین پر مال و دولت اور ساز و سامان ہے اس کو ہم نے اس لیے پیدا فرمایا کہ لوگ اسے میرے حکم کیمطابق استعمال کریں۔ پھر میں دیکھتا رہوں کہ کون ان کے ساتھ بہتر عمل کرنے والا ہے۔

شام کی جامع مسجد میں ایک دن حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنے مسلک و موقف کی وضاحت کرتے ہوئے جو خطبہ دیا اُس کی چند جھلکیاں حسبِ ذیل ہیں۔

اسلام کا پہلا معاشی پہلو یہ ہے کہ سرمایہ دار قرآن مجید کے اس حکم پر عمل کریں جو اس ضمن میں انہیں دیا گیا ہے۔ اور اگر عمل نہ کریں تو حکمران جبراً عمل کرائیں۔ یعنی ضرورت سے زائد اموال ہر قسم کے حاجت مندوں کو دے دو۔ اس میں زمین، مکان، دکان، مال و دولت، مویشی اور اجناس وغیرہ سب کچھ شامل ہیں۔ اور اگر سرمایہ دار ایسا نہ کریں تو حکومت انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرے۔

یہ ایمان کا پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرے مرحلہ میں کہا گیا ہے کہ لوگ اس نظام کو اپنا لیں اور پھر وہ اس بات پر بھی ایمان رکھیں۔

يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ انفسهم ولو كان بهم خصاصة۔

یعنی وہ خود تنگی میں گزارہ کرتے ہیں اور دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔

اور حد کمال یہ ہے کہ وہ دینے کے بعد اس پر بھی یقین وایمان رکھتے ہیں کہ وہ دُوسروں کی نشو ونما کے لیے کسی جزا اور شکریہ کو بھی اپنے لیے مستحق نہیں جانتے جیسے کہ قرآنِ کریم نے ان کی یہ صفات واضح کی ہیں۔

لا نرید منکم جزاءً ولا شکوراً (۷۶/۹)

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ معاشیات اور جسم کے بدلے میں ایک اور معاہدہ کرتے ہیں۔ فرمایا:

"مسلمان جنت کے بدلے میں اپنی جانیں اور مال اللہ کی راہ میں فروخت کر چکے ہیں۔ اور ان کی ہر چیز اللہ کے لیے ہے۔" (۹/۱۱۱)

وہ اللہ کے نام پر اللہ کے بندوں کی نشو ونما اور بہتری کے لیے اپنی جانیں اور مال قربان کر دیتے ہیں۔ یہ ان کا آخری مرحلہ ہے اور یہی مستقل قوت عمل اور جذبہ محرکہ ہے جس پر ایک مسلمان عمل کر کے اس دُنیا کو بھی جنت بنا سکتا ہے۔ اس نظریہ کے حکمران مسلسل اپنے ملک اور عوام اور پھر ساری دنیا کو پیغام عمل دیتے ہیں اور یہی عوام اور حکمران اصل کامیاب اور معاہدہ کی رو سے جنت کے مستحق ہیں۔ معاشی تحفظ کے حق سے متعلق حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے مسلک و موقف کی آپ کے مواعظ حسنہ سے جو وضاحت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نماز کے فوراً بعد ایمان والوں پر جو اولیں حق قائم ہوتا ہے وہ انفاق ہے یعنی خدا کے دیئے مال میں سے اس کے حاجت مند بندوں کی کفالت۔ یہ ترتیب حقوق کسی ایک آیت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ پورا قرآن صلوٰۃ کے فوراً بعد زکوٰۃ کے لاحقہ کو ساتھ لیے آگے بڑھتا ہے بلکہ بعض مقامات پر وہ صلوٰۃ کو ایسی صورت میں بالکل ضائع قرار دیتا ہے جہاں نماز پڑھنے والے نے کسی حاجت مند کی ضرورت پُوری کرنے میں بخل سے کام لیا ہو۔ سورۃ الماعون میں ارشاد ہوتا ہے۔

"تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے

سے انکار کرتے ہیں۔"

جو شخص غیب پر یعنی آخرت کی جزاوسزا پر ایمان نہیں لاتا۔ اس سے نہ خدا کا حقِ صلوٰۃ ٹھیک طور پر ادا ہوتا ہے اور نہ وہ انفاق کے ذریعہ اپنے حاجت مند بھائیوں کی کفالت کا حق ادا کرسکتا ہے۔ نماز ادا کرتا ہے تو سستی اور کاہلی سے اور محض دکھاوے کی خاطر اور اللہ کے دیئے ہوئے مال پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو نہ صرف یہ کہ خود کھانا نہیں دیتا بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب نہیں دیتا۔ اور کوئی حاجت مند معمولی ضرورت کی چیز بھی مانگے تو صاف انکار کر دیتا ہے۔ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنے والوں کو صاف وعید سنائی جا رہی ہے کہ تمہاری یہ نماز تمہارے کسی کام نہ آئے گی۔ یہ تمہارے منہ پر دے ماری جائے گی۔ اور خدا بندوں کا حق ادا نہ کرنے کے جرم میں تمہیں جس تباہی کا سامنا کرنا ہوگا یہ نماز تمہیں اس سے بچا نہ سکے گی۔

قرآن کریم میں ۳۰ سے زائد مقامات پر اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر ہے اور ۷۰ سے زائد مقامات پر انفاق کا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اپنے مواعظ حسنہ میں فرماتے کہ خدا کے بندو مال خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا بڑھتا ہے۔ یہ خسارے کا نہیں سراسر نفع کا سودا ہے۔ یہ لینے والے پر نہیں خود دینے والے کے اپنے نفس پر احسان ہے۔ کیونکہ اس کا نفع کئی گنا ہو کر اس کی طرف پلٹ آئے گا۔

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بُخل سے کام لیتے ہیں، وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بُخل ان کے لیے اچھا ہے۔ جو کوئی جو کچھ اپنی کنجوسی سے جمع کرے گا قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔

جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اُس کے پاس رہے گا، ہرگز نہیں۔ وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا۔

(مسند دارمی، ترمذی، مسلم)

حدیث کی راوی فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام مسجد میں تشریف فرما تھے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ آپ نے سورۂ بقر کی وہ آیات تلاوت کیں جن میں کہا گیا ہے کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو، اصل نیکی یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنا دل پسند مال خرچ کرو۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اسلامی معاشرے کے قواعد میں سے آخری قاعدہ جو اُس کو صحیح راستے پر قائم رکھنے کا ضامن تھا، یہ تھا کہ مسلم معاشرے کے ہر فرد کا نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض بھی ہے کہ کلمۂ حق کہے، نیکی اور بھلائی کی حمایت کرے اور معاشرے و مملکت میں جہاں بھی غلط اور نارو اکام ہوتے نظر آئیں ان کو روکنے میں اپنی امکانی حد تک پوری کوشش صرف کر دے۔ قرآن مجید کی ہدایات اس باب میں یہ ہیں۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (المائدہ: ۲)

"نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔"

○

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (الاحزاب: ۷۰)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔"

○

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (النساء: ۱۳۵)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف پر قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، خواہ تمہاری گواہی خود تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین یا قریبی رشتہ داروں کے خلاف پڑے۔"

(مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد کچھ لوگ حکمران ہونے والے ہیں، جو اُن کے جھوٹ کی تائید کرے اور اُن کے ظلم میں ان کی مدد کرے وہ مجھ سے نہیں اور میں اُس سے نہیں۔

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ .... وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (التوبہ : ۶۷-۷۱)

"منافق مرد اور عورتیں ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، وہ برائی کا حکم دیتے اور بھلائی سے روکتے ہیں .... اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں وہ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔"

قرآن میں اہلِ ایمان کی امتیازی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔ (التوبہ : ۱۱۲)

"نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے منع کرنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی اس معاملہ میں یہ ہیں۔

- تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اسے چاہیئے کہ اس کو ہاتھ سے بدل دے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے برا سمجھے اور روکنے کی خواہش رکھے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"افضل الجهاد کلمۃ الحق عند سلطان جابر۔"

"سب سے افضل جہاد جابر حکمران کے سامنے حق کی بات کہنا ہے۔"

قرآن حکیم میں اہلِ ایمان کی امتیازی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے منع کرنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یہ ہیں۔

"لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ ان پر عذاب عام بھیج دے۔"

(ابوداؤد، کتاب الملاحم)
(ترمذی، کتاب الفتن)

حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا۔

"عنقریب تم پر ایسے لوگ حاکم ہوں گے جن کے ہاتھ میں تمہاری روزی ہوگی۔ وہ تم سے بات کریں گے تو جھوٹ بولیں گے اور کام کریں گے تو بُرے کام کریں گے۔ وہ تم سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی بُرائیوں کی تعریف اور اُن کے جھوٹ کی تصدیق نہ کرو۔ پس تم ان کے سامنے حق پیش کرو۔ جب تک وہ اسے گوارا کریں۔ پھر اگر وہ اس سے تجاوز کریں تو جو شخص اس پر قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔"

○

من ارضی سلطانا بما یسخط ربه خرج من دین اللہ۔

"جس نے کسی حاکم کو راضی کرنے کے لیے وہ بات کی جو اس کے رب کو ناراض کر دے وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔"

صحاح میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"میرے حبیب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے وصیت کی ہے کہ میں سچ بات کہوں اگرچہ وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو۔"

اسی طرح آپ کا قول یہ بھی تھا۔

"اولی الامر کی اطاعت ہم پر ضرور فرض ہے اگر تین باتوں میں وہ مانع نہ ہو۔ بھلائی اور نیکی کی تعلیم دینے سے۔ برائیوں کے روکنے سے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی نشر و اشاعت کھل کر کریں۔"

لاطاعۃ فی معصیۃ اللہ، انما الطاعۃ فی المعروف۔"

"اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت صرف معروف میں ہے۔"

مشہور حنفی فقیہہ ابوبکر محمد الجصّاص اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "فاسق کی امامت باطل ہے اور وہ خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو اس منصب پر مسلط کر دے تو لوگوں پر اس کا اتباع اور اس کی اطاعت لازم نہیں ہے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۷۹-۸۰)

"السمع والطاعۃ علی المرء المسلم فیما احب او کرہ مالم یومر معصیۃ فاذا امر معصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ۔"

"ایک مسلمان پر اپنے امیر کی سمع و طاعت فرض ہے خواہ اس کا حکم اسے پسند ہو یا ناپسند تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے تو پھر کوئی سمع و طاعت نہیں۔"

حق کی بات کہنے میں ابوذر رضی اللہ عنہ جابر و قاہر سلطان سے بھی نہ ڈرتے تھے۔ جس زمانے میں ابوذر رضی اللہ عنہ شام گئے امیر شام کا محل الخضرا تیار ہو رہا تھا۔ ہزاروں مزدور کام پر لگے تھے۔ ابوذر نے زیر تعمیر اس محل کو دیکھا تو فرمایا۔

"اگر یہ خدا کے مال سے تعمیر ہو رہا ہے تو خیانت ہے اور اگر امیر شام کے مال سے ہے تو اسراف ہے۔"

ایک دن ابوذر رضی اللہ عنہ ایک مسجد میں بیٹھے تھے۔ مسلمان ان سے امیر شام کی شکایت کرنے لگے کہ سال بھر ہو گیا ہے عطیات میں سے کچھ نہیں ملا۔ ابوذر نے سر جھکا لیا۔ پھر کھڑے ہوئے۔ لوگ آپ کی طرف دیکھنے لگے تو آپ نے لوگوں

سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"لوگو! اب تو ایسی بدعتیں جاری ہو گئی ہیں جو نہ قرآن میں ہیں نہ حدیث میں۔ خدا کی قسم میں دیکھتا ہوں کہ حق مٹتا جا رہا ہے۔ باطل زندہ ہوتا جاتا ہے۔ سچوں کو جھٹلایا جا رہا ہے۔ فاسقوں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔

اے مال دار لوگو! فقیروں کی غم خواری کرو۔ خبردار کردو ان لوگوں کو جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور راہِ خدا میں صرف نہیں کرتے۔ ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو آگ سے داغ دیا جائے گا۔"

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ حق گوئی، حق پرستی، حق نویسی کے معاملے میں بڑے دھار دار تھے۔ حق کی بات کرتے چاہے ان کے اپنے ہی خلاف کیوں نہ جاتی ہو۔

اسلامی ریاست کے حدودِ اطاعت

اسلامی خلافت کو چلانے کے لیے جو ریاست قائم ہو گی عوام اس کی صرف اطاعت فی المعروف کے پابند ہوں گے۔ معصیت (قانون کی خلاف ورزی) میں نہ کوئی اطاعت ہے اور نہ تعاون۔

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (المائدہ: ۲)

"نیکی اور پرہیزگاری میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (الدھر: ۲۴)

"اُن میں سے کسی گناہ گار اور ناشکرے کی اطاعت نہ کرو۔"

اسلامی ریاست کا پورا کام اس کی تاسیس و تشکیل سے لے کر رئیسِ مملکت اور اولی الامر کے انتخاب اور تشریعی و انتظامی معاملات تک، اہلِ ایمان (شوریٰ) کے باہمی مشورے سے چلنا چاہیے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ مشاورت بلاواسطہ ہو یا منتخب نمایندوں

کے ذریعہ سے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ۔ (الشوریٰ : ۳۸)

اس ریاست کا نظام چلانے کے لیے اولی الامر کے انتخاب میں جن امور کو ملحوظ رکھنا چاہیئے وہ یہ ہیں۔

وہ ان اصولوں کو مانتے ہوں جن کے مطابق خلافت کا نظام چلانے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ ایک نظام کو چلانے کی ذمہ داری اُس کے اصولی مخالفین پر نہیں ڈالی جا سکتی۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسُول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔"

یہ کہ وہ ظالم، فاسق و فاجر، خُدا سے غافل اور حد سے گزر جانے والے نہ ہوں بلکہ ایماندار، خدا ترس اور نیکوکار ہوں۔ کوئی ظالم یا فاسق اگر امارت یا امامت کے منصب پر قابض ہو جائے تو اس کی امارت اسلام کی نگاہ میں باطل ہے۔

"اور تو اطاعت نہ کر کسی ایسے شخص کی جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔ اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کی اور جس کا کام حد سے گزرا ہوا ہے۔"

اس ریاست کا دستور جن بنیادی اصولوں پر قائم ہو گا وہ یہ ہیں۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔"

یہ آیت چھ دستوری نکات واضح کرتی ہے:

۱۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہر اطاعت پر مقدم ہے۔

۲۔ اولی الامر کی اطاعت کا اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے تحت ہونا۔

۳۔ یہ کہ اولی الامر اہلِ ایمان میں سے ہو۔

۴۔ یہ کہ لوگوں کو حکام اور حکومت سے نزاع کا حق ہے۔

۵۔ یہ کہ نزاع کی صورت میں آخری فیصلہ کن سند خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قانون ہے۔

۶۔ یہ کہ نظامِ خلافت میں ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیئے جو اولی الامر اور عوام کے دباؤ سے آزاد رہ کر بالاتر قانون کے مطابق جملہ نزاعات کا فیصلہ دے سکے۔

ا۔ منتظمہ کے اختیارات لازماً حدود اللہ سے محدود اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون سے محصور ہوں گے جس سے تجاوز کر کے وہ نہ کوئی ایسی پالیسی اختیار کر سکتی ہے، نہ کوئی ایسا حکم دے سکتی ہے جو معصیت کی تعریف میں آتا ہو کیونکہ اس آئینی دائرے سے باہر جا کر اسے اطاعت کے مطالبہ کا حق نہیں پہنچتا۔

علاوہ بریں یہ منتظمہ لازماً شوریٰ یعنی انتخاب کے ذریعہ سے وجود میں آنی چاہیئے اور اسے شوریٰ یعنی باہمی مشاورت ہی کے ساتھ کام کرنا چاہیئے لیکن انتخاب اور مشاورت دونوں کے متعلق قرآن قطعی اور متعین صورتیں مقرر نہیں کرتا بلکہ ایک وسیع اصول قائم کر کے اس پر عمل درآمد کی صورتوں کو مختلف زمانوں میں معاشرے کے حالات اور ضروریات کے مطابق طے کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔

ب۔ مقننہ لازماً ایک شوروی ہیئت (Consultative Body) ہونی چاہیئے لیکن اس کے اختیاراتِ قانون سازی بہرحال ان حدود سے محدود ہوں گے جو اوپر بیان کیے جا چکے ہیں۔

جہاں تک اُن امور کا تعلق ہے جن میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح احکام دیئے ہیں یا حدود اور اصول مقرر کیے ہیں، یہ مقننہ ان کی تعبیر و تشریح کر سکتی ہے۔ ان پر عملدرآمد کے لیے ضمنی قواعد اور ضابطہ کارروائی تجویز کر سکتی ہے مگر ان میں ردوبدل نہیں کر سکتی۔ رہے وہ امور جن کے لیے بالاتر قانون ساز نے کوئی قطعی احکام نہیں دیئے ہیں، نہ حدود اور اصول متعین کیے ہیں، ان میں اسلام کی سپرٹ

اور اس کے اصول عامہ کے مطابق مقننہ ہر ضرورت کے لیے قانون سازی کر سکتی ہے، کیونکہ ان کے بارے میں کوئی حکم نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شارع نے ان کو اہلِ ایمان کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

ت۔ عدلیہ ہر طرح کی مداخلت اور دباؤ سے آزاد ہونی چاہیئے تاکہ وہ عوام اور حکام سب کے مقابلہ میں قانون کے مطابق بے لاگ فیصلہ دے سکے۔ اسے لازماً ان حدود کا پابند رہنا ہوگا اور اس کا فرض ہوگا کہ اپنی اور دُوسروں کی خواہشات سے متاثر ہوئے بغیر ٹھیک ٹھیک حق اور انصاف کے مطابق معاملات کے فیصلے کرے۔

اس ریاست کا مقصد وجود یہ ہے کہ اس کو دو بڑے مقاصد کے لیے کام کرنا چاہیئے۔ اول یہ کہ انسانی زندگی میں عدل قائم ہو اور ظلم و جور ختم ہو جائے۔

"ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔"

دُوسرے یہ کہ حکومت کی طاقت اور وسائل سے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا جائے جو اسلامی زندگی کا ستون ہے۔ بھلائی اور نیکی کو ترقی دی جائے جو دنیا میں اسلام کے آنے کا اصل مقصود ہے اور بُرائی کو دبایا جائے جو اللہ کو سب سے زیادہ مبغوض ہے۔

اس نظام میں رہنے والے مسلم و غیر مسلم باشندوں کے بنیادی حقوق یہ ہیں جنہیں تعدی سے محفوظ رکھنا ریاست کا فرض ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے ان بنیادی حقوق کی ہمیشہ تائید و حمایت کی۔ آپ فرماتے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حق میں تنقید کی آزادی کا بھی حق ہے۔ ضمیر و اعتقاد کی آزادی کا حق بھی۔

"لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن"

مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق۔

"یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن معبودوں کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو۔"

اس معاملہ میں قرآن یہ صراحت کرتا ہے کہ مذہبی اختلافات میں علمی بحث تو کی جاسکتی ہے مگر احسن طریقہ سے ہونی چاہیئے۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات کے بارے میں ابوذر رضی اللہ عنہ اس کے پُرزور حامی تھے کہ وہ خود مختاری کی مالک ہوتے ہوئے اپنی مرضی سے خود رب العالمین کے آگے تسلیم خم کر دے گی اور اس کے ماتحت حاکمیت کے بجائے خلافت کی حیثیت قبول کرکے ان ہدایات و احکام کے مطابق کام کرے گی جو اس نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے عطا کئے ہیں۔ ان کی زبان پر بس ایک ہی نعرۂ حق تھا۔ حقوق اور مرتبے اور دولت میں مساوات۔ توازن کی فرماں روائی۔ نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون۔ خدا کے سامنے ذمہ داری کا احساس۔ معاشرے میں کسی شخص کو ناگزیر لوازمِ حیات سے محروم نہ رہنے دینا۔ ان بنیادی انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہ کرنا۔ اگر ریاست مختارِ مطلق اور ہمہ گیر اقتدار کی مالک بن کر افراد کو اپنا بے بس مملوک بنالے تو اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا۔ کیونکہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اہلِ ایمان کی حکومت دراصل خلافت ہے جسے مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ اُس کو لازماً اس قانونِ خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کرنا چاہیے جس کا ماخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ قرآن مجید کی آیاتِ ذیل اس معاملہ میں بالکل واضح ہیں۔

النساء ـــ المائدہ ـــ الاعراف ـــ یوسف ـــ النور ـــ

الاحزاب ـــ الحشر ـــ

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ غریب الوطنی کے زمانے میں بیابانِ ربذہ میں بھی اپنے آخری دم تک یہی فرماتے رہے کہ اللہ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ حُرمتیں مقرر کی ہیں انہیں نہ توڑو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے بارے میں سکوت فرمایا ہے۔ بغیر اس کے کہ نسیان لاحق ہوا ہو ان کی کھوج میں نہ پڑو۔ جس نے کتاب اللہ کی پیروی کی وہ نہ دنیا میں گمراہ ہوگا نہ آخرت میں۔ دیکھو جو کچھ حق ہے وہ سب کے لیے حق ہے۔ جو گناہ ہے وہ سب کے لیے گناہ ہے۔ جو حرام ہے وہ سب کے لیے حرام ہے۔ جو حلال ہے وہ سب کے لیے حلال ہے اور جو فرض ہے

وہ سب کے لیے فرض ہے۔ قرآن اور سنت کا دیا ہوا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ اور اس کو مملکت کے ادنیٰ ترین آدمی سے لے کر مملکت کے سربراہ تک سب پر یکساں نافذ ہونا چاہیئے۔ عدل بین الناس، کسی کے لیے بھی اس میں امتیازی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعلان کرنے کی ہدایت فرماتا ہے۔

وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ (الشوریٰ)

"اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں"۔

ایک مرتبہ حکومت شام کے ایک باغی گروہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو گھیر لیا۔ اور پوچھا کہ ریاست کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ جواباً آپ نے فرمایا کہ ریاست کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ معاشرہ میں کسبِ حرام کے تمام دروازے بند کر دے کسبِ حلال کی راہیں کشادہ کرے اور اپنے معاشی منصوبوں کے ذریعے ہر فرد کو کسبِ حلال کیلئے ضروری تعلیم و تربیت کے مواقع فراہم کر کے معاشی جدوجہد کے قابل بنائے۔

اس کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے مقرر کردہ حقوق دلانے میں ان کی مدد کرے۔ کوئی بیٹا باپ کی کفالت سے انکار کرے تو وہ قانوناً اسے اس کفالت کا پابند بنائے۔ کوئی شوہر بیوی کا مہر یا نفقہ یا بچوں کا حق دینے سے انکار کرے تو اس سے بزور یہ حق دلایا جائے۔ غرض جس کا جو حق نکلتا ہو وہ اس کی ادائیگی کو یقینی بنائے۔

ریاست کی تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کے نظام کو قائم کرے اور مستحقینِ زکوٰۃ کا حق صاحبِ نصاب لوگوں سے وصول کر کے ان تک پہنچائے یا ان کی فلاح و بہبود پر خرچ کرے۔

ریاست کی چوتھی ذمہ داری یہ ہے کہ جن کا کوئی کفیل نہ ہو، ان کی کفیل خود بنے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے"۔ (ترمذی)

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہے۔"

(ترمذی)

اسی طرح آپ نے مرنے والے کے قرض کی ادائیگی اور اس کے پسماندگان کی سرپرستی بھی اسلامی حکومت کی ذمہ داری قرار دی۔

"جو مسلمان قرض چھوڑ کر وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کا ہوگا۔"

(بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

"جو شخص مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے گھر والوں کے لیے ہے۔ اور جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔"

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریوں کے سلسلے میں یہ اصول بیان فرمایا۔

"انہیں اطلاع دینا کہ اللہ نے ان کے مالوں میں صدقہ فرض کیا ہے۔ جو ان کے مال داروں سے لیا جائے گا اور ان کے ناداروں پر تقسیم کیا جائے گا۔" (بخاری، موطا، ابوداؤد، ترمذی)

یہ معاشی تحفظ صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں غیر مسلم رعایا بھی اس کی یکساں حقدار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اسے گھر لے گئے پہلے اپنے گھر سے کچھ دیا اور پھر بیت المال کے خزانچی کو بلا کر ہدایت کی کہ اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا روزینہ مقرر کر دو۔ اور فرمایا۔

خدا کی قسم! یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے جزیہ لے کر کھائیں اور بڑھاپے میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں شہریوں کے معاشی حقوق کے سلسلہ میں حسبِ ذیل ضروریات کی فراہمی حکومت کے ذمہ رکھی تھی۔

۱۔ خورد و نوش کا ضروری سامان۔

۲۔ سردی اور گرمی کے کپڑے۔

۳۔ حج اور جہاد کے لیے سواری۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں عام شہریوں سے لے کر نومولود بچّوں تک کے وظائف بیت المال سے مقرر ہوئے۔ اور انہیں معاشی احتیاجات سے مکمل طور پر نجات دلائی گئی۔ بیت المال کا یہ استعمال حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے دَور میں بھی برقرار رہا۔

اسلام میں معاشی مسئلہ

اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور انسان کی معاشی سرگرمیوں کو مستحسن بلکہ بسا اوقات واجب اور ضروری قرار دیتا ہے۔ انسان کی معاشی ترقی اس کی نگاہ میں پسندیدہ ہے۔ اور کسبِ حلال اس کے نزدیک فرض ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی اتنی ہی واضح ہے کہ اسلام میں انسان کا بنیادی مسئلہ معاش نہیں ہے اور نہ ہی معاشی ترقی انسان کا مقصدِ حیات ہے۔ کسی کام کا جائز، مستحسن یا ضروری ہونا ایک الگ بات ہے لیکن اس کا مقصد زندگی اور محورِ فکر و عمل ہونا بالکل جدا چیز۔

درحقیقت اسلامی معاشیات اور مادی معاشیات میں ایک گہرا بنیادی اور دُور رس فرق یہی ہے کہ مادی معاشیات میں معاش انسان کا بنیادی مسئلہ اور معاشی ترقیات اس کی زندگی کا منتہائے مقصود ہیں اور اسلامی معاشیات میں یہ چیزیں ضروری اور ناگزیر سہی لیکن انسان کی زندگی کا اصل مقصد نہیں ہیں۔ قرآنِ حکیم کی نظر میں تمام وسائل معاش انسان کی رہگذر ہیں۔ اس کی اصل منزل درحقیقت ان سے آگے ہے۔ اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجے میں آخرت کی بہبود۔ انسان کا اصل مسئلہ اور اس کی زندگی کا بنیادی مقصد انہی دو منزلوں کی تحصیل ہے۔ لیکن چونکہ ان دو منزلوں کو دنیا کی شاہراہ سے گزرے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے وہ تمام چیزیں بھی انسان کے لیے ضروری ہو جاتی ہیں جو اس کی دنیوی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔

چنانچہ جب تک وسائل معاش انسان کی اصلی منزل کے لیے رہگذر کا کام دیں وہ فضل اللہ اور خیر ہیں لیکن جہاں انسان اسی رہگذر کی بھول بھلیاں میں اُلجھ کر رہ گیا تو

پھر یہی وسائل معاش اُس کے لیے فتنہ اور عذاب بن جاتے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ کی تبلیغی سرگرمیوں میں یہ بنیادی موضوع تھا۔

کتب حدیث میں آپ کے مواعظ اور تذکیرات کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہے اور اس باب میں تمام صحابہ سے الگ تھلگ ایک خاص ذوق کے آپ مالک تھے۔ حج کے موسم میں خصوصیت کے ساتھ آپ کا یہ تبلیغی جذبہ خاص طور پر اُبھر جاتا۔ جہاں کچھ لوگ نظر آتے آپ کھڑے ہو جاتے اور فرماتے۔

"جو مجھے جانتے ہیں وہ تو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ یہ جان لیں کہ میں صحابی رسول ابوذر غفاری ہوں۔"

مجھ سے اسلام میں معاشی ذمہ داری کے متعلق پوچھا گیا ہے۔ قسم ہے اس خُدا کی جس کے قبضے میں میری جان ہے میں وہی کہوں گا جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ہے۔ اسلام نے رزق کے بارے میں اپنا نظریہ صاف صاف بیان کیا ہے۔ اللہ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

"ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کی ذمہ داری لیتے ہیں۔"

"روئے زمین پر بسنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔"

"یہ زمین اللہ کی تمام مخلوق کی ضرورت کے لیے ہے۔"

اور حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

"بھوک اور غریبی انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔"

اے لوگو! زمین اور اس کی ہر طرح کی پیداوار رزق میں شامل ہے۔ یہ رزق تمام جانداروں کے لیے بافراط پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اس رزق کے حصول کے لیے کتنی محنت کرتا ہے۔ اگر حیوانوں اور انسانوں کو پوری زمین پر آزاد چھوڑ دیا جائے ان پر کسی قانون کو لاگو نہ کیا جائے تو پھر ہر جاندار کے لیے کوئی کمی نہیں۔ کوئی حیوان اور انسان زمین پر بھوکا نہیں رہ سکتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی بھوکا آدمی اپنی ذات اور اپنے کنبے کے بھوکے افراد کے لیے کسی سرمایہ دار کے مال کی چوری کر لیتا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ کوئی عیب نہیں۔ اس کے خلاف سرمایہ دار کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔ اگر سرمایہ دار ایسے بھوکے چور کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا تو چور اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر معاشرہ اور حکمران طبقہ پھر دوسرے وقت بھی چور اور اس کے بھوکے خاندان کے لیے معاش اور رزق کے لیے کوئی انتظام نہیں کرتا تو چور پھر سرمایہ دار کا مال چوری کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اسے اس وقت تک اس فعل سے روکا نہیں جا سکتا جب تک معاشرہ اور حکمران طبقہ اس کی اس حالت کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا انسانی دُنیا میں رزق کی تقسیم کا منصفانہ بندوبست اللہ پر نہیں بلکہ حکمران طبقہ پر ہے۔ اللہ کی ذمہ داری اتنی ہے کہ اس نے انسانوں کے لیے رزق زمین کے اُوپر اور نیچے پیدا کر کے دے دیا ہے اور مزید پیدا کرتا چلا جا رہا ہے۔ یہ رزق قیامت تک ختم نہیں ہو سکتا لیکن اس کی منصفانہ تقسیم حکمرانوں کی ذمہ داری ہے۔

اللہ نے پیدائشی طور پر نہ کسی کو غریب پیدا کیا ہے اور نہ امیر۔ امیری اور غریبی کا تعلق معاشرہ میں قائم نظام سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نظام قائم کر دیا جائے کہ رزق کی تقسیم منصفانہ طریقہ پر ہوتی رہے تو پھر نہ کسی کی صلاحیت دبی رہتی ہے اور نہ کسی کی ضرورت رُکی رہتی ہے۔ معاشرہ میں بگاڑ تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب معاشرے کے اجارہ دار ذرائع پیداوار پر قابض ہو کر بے شمار لوگوں کو بھوک اور افلاس کے خوفناک جہنم میں جھونک دیتے ہیں۔

نزولِ قرآن کے وقت ایک طبقہ موجود تھا جس کو قرآن حکیم نے متکبرین الملأ اور مترفین کہہ کر پکارا ہے اور اُن کے مقابل میں دُوسرے طبقہ کو مستضعفین مسکین اور محروم کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ایک ظالم اور دُوسرا مظلوم۔ قرآن حکیم نے سرمایہ اور مترفین کے بارے میں کہا ہے کہ جب ان سرمایہ داروں سے کہا جاتا ہے کہ تم رزق اور سرمایہ کو تمام انسانوں کے مفاد کے لیے کھلا رکھو تا کہ کوئی بھوکا نہ رہے تو وہ کہتے ہیں کیا ہم

ان غریب لوگوں کو روٹی کھلائیں جن کو اگر اللہ تعالیٰ کھلانا چاہے تو وہ خود کھلا سکتا ہے۔
چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی ضروریات کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ وہ آدمی مسلمان نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا بیٹھا رہے۔"

ایسے ہی معاشرہ کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھوک اور غربت کی وجہ سے انسان کفر اور باطل کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ مسلمان رہنے کے لیے بھی ضروریاتِ زندگی کا حاصل ہونا ضروری ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے لوگوں کو دعوت دی تھی کہ دُنیا اور آخرت کی ضروریات ہماری دعوت اور ہمارے نظام میں ہے تو غریب اور رزق سے محروم لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا تھا۔ جبکہ مترفین اور متکبرین ان سے نفرت کرتے تھے۔ ہر دور اور ہر زمانہ میں غریب اور وسائل رزق سے محروم لوگوں کی اکثریت نے انبیاء کا ساتھ دیا تھا۔

قرآن کے مطابق سرمایہ داروں اور دولت مندوں نے اسلام اور اس کی دعوت دینے والوں کی پُرزور مخالفت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کر کے فرمایا:

"تم اگر اسلام قبول کر لو تو عرب و عجم کے حکمران بن جاؤ گے۔ تمام دُنیا پر تمہاری فرمانروائی ہوگی۔ دولت کے تمام خزانوں پر تمہارا قبضہ ہوگا۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے گا۔ کوئی بھوکا نہ رہے گا۔"

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر پر تشریف فرما تھے۔ ایک بوڑھا اعرابی درِ دولت پر حاضر ہوا۔ اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔

"حضرت اسلام قبول کرنے سے کیا ہوگا؟"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔

"ہر قسم کی نعمتوں سے بھری جنت ملے گی۔"

اعرابی نے کہا۔

"حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ تو آخرت کا ذکر ہے۔ میں یہ پُوچھتا ہُوں کہ اس دُنیا میں کیا ملے گا؟"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"پُوری دُنیا کی حکمرانی اور رزق کی فراوانی نصیب ہوگی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہتے ہو۔"

اعرابی فوراً مسلمان ہوگیا۔ قرآن حکیم نے تو اسلام کے تمام احکام کا ماحصل ہی یہ پیش کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے تعلیم دی ہے کہ غربت کی موجودگی میں لوگ سرمایہ جمع نہ کریں۔ غریب و محتاج حاجت مند لوگوں میں ہر قسم کی فالتو چیز تقسیم کر دیں تاکہ معاشرہ متوازن و خوشحال ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

هٰانتم هؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل الله فمنکم من یبخل ومن یبخل فانما یبخل عن نفسه والله الغنی وانتم الفقراء وان تتولّوا یستبدل قومًا غیرکم ثم لایکونوا امثالکم

(۴۷ : ۳۴)

لوگو! تم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تم (زائد از ضرورت) سامان اور مال و دولت غریب عوام میں خرچ کر دو۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے بہت سے لوگ مال و دولت جمع کر رہے ہیں۔ حالانکہ جمع کرنے سے روکا گیا تھا۔ جو شخص اپنا مال روک رکھتا ہے وہ (آخرت کے لحاظ سے) اپنا نقصان آپ کرتا ہے۔ اللہ کو تو خود کسی مال و دولت اور سامانِ زندگی کی ضرورت نہیں۔ اگر تم حکم کی نافرمانی کرو گے تو تمہاری جگہ کوئی دُوسری قوم پیدا کر لی جائے گی جو تمہاری طرح مال و زر جمع کرنیوالی نہ ہوگی۔"

اللہ نے حکم دیا ہے کہ تم ہمارا دیا ہوا پاکیزہ اور حلال رزق کھاؤ۔ اس کو جمع کر کے اور روک کر نہ رکھو۔ ورنہ اللہ کا عذاب ضرور نازل ہوگا اور جس پر اللہ کا عذاب نازل ہوا وہ تباہ ہو کر رہا۔

جو لوگ خدا کے عطیات اور انعامات کو اپنی ذاتی ضروریات اور مفادات کے لیے روک لیتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کا یہ طریقہ ان کے لیے خیر ثابت ہو گا بلکہ یہ قطعی شر اور تباہی ہے۔ قیامت کے روز اسی مال و دولت کو گلے کا طوق بنا کر پہنایا جائے گا۔ صرف اس وجہ سے کہ اس نے غریب میں تقسیم کرنے سے اپنے مال کو دُنیا میں روک لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ کی ملکیت ہے۔

انسان جہنم میں کہے گا کہ اب اس کے مال و دولت نے کوئی بچاؤ نہ کیا۔ اس کی حکومت اور اس کا اقتدار بھی تباہ ہو گیا۔ اے فرشتو! اس کو پکڑ کر زنجیریں پہنا دو اور جہنم میں پھینک دو۔ اس نے دُنیا میں اللہ کو نظرانداز کیا۔ یہ دُنیا میں کسی غریب اور مزدور کے کھانے کا بندوبست نہ کرتا تھا۔ پس آج اس کا کوئی دوست نہیں ہے اور اس کا کھانا زخموں کا دھوون اور پیپ ہے۔ جہنم میں آگ مُنہ اور گالوں کی کھالوں کو ادھیڑ دے گی۔ اس لیے کہ انسان نے حق سے منہ پھیرا اور مال پر مال جمع کیا۔ اس کو غریبوں میں تقسیم نہ کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے ابوذر! لوگوں سے کہہ دو کہ وہ ہر فالتو اور زائد مال حاجتمندوں میں تقسیم کر دیں۔"

ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"اے لوگو! تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن اور مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دوسرے حاجتمند کو وہی کچھ نہ کھلائے جو وہ خود کھلاتے۔ وہی کچھ نہ پہنائے جو خود پہنتا ہو۔ وہی سواری نہ دے جو

خود پسند کرتا ہو۔"

ابوذر رضی اللہ عنہ آیات و احادیث کے حوالے سے اسلامی معاشی مساوات لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ ان آیات و احادیث کو منسوخ کرنے کے لیے بعض سرمایہ داروں اور نفس پرست عالموں نے یہ کہا کہ یہ سب کچھ خود ساختہ ہے۔ جس مال کی محض زکوٰۃ دے دو وہ کنز اور خزانہ نہیں مال کا حق صرف مقررہ زکوٰۃ ہے۔ حالانکہ کتب احادیث میں ایک حدیث ملتی ہے جس میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق مال ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سرمایہ دار کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی ایک حق ہے۔" (ترمذی)

آپ نے مزید فرمایا۔

"جس فرد کے پاس فالتو اور زائد زمین ہے وہ اپنے بھائی کو دیدے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارِ مدینہ کو حکم دیا کہ وہ فالتو مکانات، دکانات اور فالتو زمین مہاجرین میں مفت تقسیم کر دیں۔ اس پر فوری عمل اور سب کچھ مفت تقسیم کر دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باغ فدک کی تمام آمدنی میں سے ایک سال کا خرچ رکھ لیتے اور باقی سب کچھ تقسیم کر دیتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دور میں تو سب خوشحال تھے کوئی غریب نہ تھا۔ مزدوروں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ملازم اور مزدور تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ نے ان کو مالکوں کے ماتحت بنایا ہے۔ اب مالکوں کا فرض ہے کہ وہ کھانے کے جو وسائل رکھیں وہ اپنے بھائیوں کو بھی دیں۔ جو خود پہنیں وہ ان کو پہنائیں۔ اگر کام سخت ہو تو خود بھی اس میں شریک ہوں۔" (بخاری شریف)

ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

"اگر مزدور غلطی کرے تو کتنی بار معاف کیا جائے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا۔

"اگر مزدور ستّر بار بھی غلطی کرے تو تم اُسے معاف کرتے رہو۔"
(مشکوٰۃ)

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ دو عمدہ چادریں خریدی تھیں۔ ایک چادر اوڑھلی۔ دوسری گھر میں رکھ دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا کہ ابوذر نے عمدہ چادر لے رکھی ہے۔ جبکہ ان کا ملازم ادنیٰ چادر رکھتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر کو بلایا اور فرمایا۔

"کیا تم میں مسلمان ہو کر بھی جاہلیت کی بُو ہے۔"

ابوذر رضی اللہ عنہ بولے۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا بات ہے؟"

آپ نے فرمایا۔

"یہ کیا مساوات ہے کہ تم نے عمدہ چادر لے رکھی ہے اور تمہارا خادم ادنیٰ چادر پہنے ہوتے ہے۔"

ابوذر رضی اللہ عنہ دوڑے دوڑے گھر گئے اور دوسری عمدہ چادر لا کر خادم کو دے دی۔

خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنی ماہانہ تنخواہ اتنی لیتے جتنی ایک مزدور کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں بہت سے دُوسرے مقامات پر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف الملاء اور مترفین کے الفاظ کا استعمال اپنے کلامِ پاک میں کیا ہے، وہاں ان کے لیے سزا بھی واضح کی ہے۔ پہلے تو دُنیا میں ان کا یہ علاج بتایا ہے کہ ان کے خلاف جنگ کی جائے اور آخرت میں یہ سزا کہ انہیں ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈال دیا جائے۔

اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت

اسلام نے تقسیم دولت کا جو نظام مقرر کیا ہے قرآن پاک پر غور کرنے سے اس کے تین مقاصد معلوم ہوتے ہیں۔

تقسیمِ دولت کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دُنیا میں معیشت کا ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے جو فطری اور قابلِ عمل ہو اور جس میں ہر انسان جبر و تشدد کے بجائے قدرتی طور پر اپنی لیاقت، اپنی استعداد، اپنے اختیار اور اپنی پسند کے مطابق خدمات انجام دے تاکہ اس کی خدمات زیادہ مؤثر، مفید اور صحت مند ہوں۔ اور یہ بات آجر اور اجیر کے صحت مند رشتہ اور رسد و طلب کی فطری قوتوں کے صحیح استعمال کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے اسلام نے انہیں تسلیم کیا ہے۔ اسی بات کی طرف مندرجہ ذیل آیت میں جامع اشارہ فرمایا گیا ہے۔

"نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیاۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعضٍ درجٰت لیتخذ بعضھم بعضا سخریا"

"ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیوی زندگی میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے تاکہ ان میں سے ایک دُوسرے سے کام لے سکے۔"

اسلام کے نظامِ تقسیمِ دولت کا دوسرا مقصد حق کا حقدار کو پہنچانا ہے۔ لیکن اسلام میں استحقاق کا معیار دوسرے نظام ہائے معیشت سے قدرے مختلف ہے۔

مادی معاشیات میں دولت کے استحقاق کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے اور وہ ہے عمل پیدائش میں شرکت۔ جتنے عوامل دولت کی پیداوار میں شریک ہوتے ہیں، انہی کو دولت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کا بنیادی اصول چونکہ یہ ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور وہی اس کے استعمال کے قوانین مقرر فرماتا ہے اس لیے اسلام میں دولت کے حق دار صرف عاملین پیدائش ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر وہ شخص بھی دولت کا مستحق ہے جس تک پہنچانا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے۔ لہٰذا فقراء و مساکین اور معاشرے کے نادار و بیکس افراد بھی دولت کے حق دار ہیں، اس لیے کہ جن عوامل پیدائش پر اوّلاً دولت تقسیم ہوتی ہے، ان کے ذمے اللہ نے لازم کیا ہے کہ وہ ان تک اپنی دولت کا کچھ حصہ پہنچائیں اور قرآنی تصریحات کے مطابق یہ مفلسوں اور ناداروں پر ان کا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ وہ فی الواقعہ دولت کے مستحق ہیں۔ ارشاد ہے۔

"فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم"

"اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک معین حق ہے۔"

اسی حق کو بعض مقامات پر اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے۔ کھیتوں کے بارے میں فرمایا جاتا ہے۔

"واتوا حقہ یوم حصادہ"

"اور اس (کھیتی) کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔"

ان دونوں آیتوں میں حق کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ استحقاق دولت کا ماخذ صرف عمل پیدائش ہی نہیں ہے بلکہ مفلس و نادار افراد بھی دولت کے ٹھیک اس طرح مستحق ہیں جس طرح اس کے اولیں مالک۔

لہٰذا اسلام دولت کو اس طرح تقسیم کرنا چاہتا ہے کہ اس سے تمام عوامل پیدائش کو ان کے عمل کا حصہ بھی پہنچ جائے اور اس کے بعد ان لوگوں کو بھی ان کا حصہ مل جائے جن کو اللہ نے مستحقِ دولت قرار دیا ہے۔

تقسیم دولت کا تیسرا مقصد جس کو اسلام نے بڑی اہمیت دی ہے، یہ ہے کہ

دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کرے اور اس طرح امیر و غریب کا تفاوت جس حد تک فطری اور قابلِ عمل ہو کم ہو جائے۔

اس سلسلے میں اسلام کا طرزِ عمل یہ ہے کہ دولت کے جو اولیں مآخذ ہیں اُن پر اس نے کسی فرد یا جماعت کا پہرہ نہیں بیٹھنے دیا۔ کانیں، جنگل، غیر مملوک بنجر زمینیں، پانی کا شکار، خودرو گھاس، دریا اور سمندر، مالِ غنیمت وغیرہ یہ تمام پیدائش دولت کے اولیں مآخذ ہیں۔ اور ان میں ہر فرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان سے اپنے کسب و عمل کے مطابق فائدہ اٹھائے اور اس پر کسی کی اجارہ داری قائم نہ ہو۔

کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم

"تاکہ (یہ دولت) تم میں سے (صرف) مالداروں کے درمیان دائر ہو کر نہ رہ جائے۔"

اس کے بعد جہاں انسانی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے اور کوئی شخص اپنے کسب و عمل سے کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو وہاں اس کے کسب و عمل کا احترام کر کے اس کی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس میں ہر ایک کو اس کے کسب و عمل کے مطابق حصہ دیا گیا ہے اور اس معاملے میں ارشاد یہ ہے۔

"ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کی فوقیت دی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔"

لیکن درجات کے باوجود کچھ ایسے احکام دے دیئے گئے ہیں کہ یہ فرق اسی قدر رہے جتنا ایک قابلِ عمل نظم معیشت کے قیام کے لیے ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دولت کا ذخیرہ صرف چند ہاتھوں میں سمٹا رہے۔

تقسیمِ دولت کے ان تین مقاصد میں سے پہلا مقصد اسلامی معیشت کو اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے۔ تیسرا مقصد سرمایہ دارانہ نظام سے۔!

اسلام کے نظام تقسیم دولت میں دولت کے مستحقین دو قسم کے ہیں۔ ایک اوّلین مستحق یعنی وہ لوگ جو کسی عمل پیدائش کے بعد بلاواسطہ اس کے مستحق ہوتے ہیں ۔ یہ مستحقین وہی عوامل پیداوار ہیں جنہوں نے کسی پیداوار کے عمل پیدائش میں حصہ لیا۔ دُوسرے ثانوی مستحقین یعنی وہ لوگ جو براہ راست عمل پیدائش میں شریک نہیں تھے لیکن عاملینِ پیدائش کے ذمے لازم کیا گیا کہ وہ اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کریں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا دولت کے اوّلین مستحق عوامل پیداوار ہوتے ہیں لیکن عوامل پیداوار کی تعیین، ان کی اصطلاحات اور ان پر تقسیم دولت کے طریقے اسلام میں بعینہٖ وہ نہیں ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں مقرر ہیں بلکہ بہت مختلف ہیں۔ اسلامی نظریے کے مطابق پیدائش کے حقیقی عوامل چار کے بجائے تین ہیں۔

۱۔ سرمایہ : یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں استعمال کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خرچ نہ کیا جائے اور اسی لیے ان کا کرایہ پر چلانا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً نقد روپیہ یا اشیائے خوردنی وغیرہ۔

۲۔ زمین : یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ ان کی اصلی شکل وصورت برقرار رہتی ہے اور اسی لیے انہیں کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً زمین، مکان، آلاتِ کشاورزی وغیرہ۔

۳۔ محنت : یعنی انسانی فعل، خواہ وہ اعضاء وجوارح کا ہو یا ذہن اور قلب کا۔ لہٰذا اس میں تنظیم اور منصوبہ بندی بھی داخل ہے۔

ان تین عوامل کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوگی وہ اوّلاً انہی تینوں پر اس طرح تقسیم کی جائے گی کہ اس کا ایک حصہ بصورت شرکت ومضاربت بہ شکل منافع ملے گا۔ دوسرا حصہ زمین کو بہ شکل کرایہ دیا جائے گا اور تیسرا حصہ محنت کو بہ شکل اُجرت ملے گا جس میں جسمانی محنت اور تنظیم ومنصوبہ بندی کی ذہنی اور فکری محنت سب داخل ہیں۔

حضرت ابوذر غفاری نے اسلام کے نظامِ تقسیم دولت کو متعدد مقامات پر اپنے مواعظہ حسنہ میں بیان کیا ہے۔ ان کے خیالات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ تمام املاک فی الاصل اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ لوگوں کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ ان کا ذاتی مال نہیں بلکہ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اللہ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا اور اسی حیثیت سے اسے دُنیا کے مال و اسباب پر تصرف کا حق دیا۔ گویا یہ حقِ ملکیت محض حق انتفاع و تصرف تک ہی محدود ہے۔ خُدا کے نائب کی حیثیت سے انسان پر لازم ہے کہ وہ ان املاک کے اصلی مالک کی مرضی کو ہمیشہ ملحوظ رکھے اور تصرف کی کوئی ایسی صورت اختیار نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کے صادر کردہ احکام سے متصادم ہو۔ اس لحاظ سے اسلام کے نظریہ ملکیت اور نظام تقسیم دولت میں ایک اخلاقی اور ماورائی پہلو شامل ہو گیا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں دولت ایک خاص طبقہ میں ساکن ہو کر رہ جاتی ہے دُوسرے لوگوں تک حرکت نہیں کرتی جس سے دوسرے لوگوں میں غربت اور افلاس رونما ہو جاتا ہے اور انسان کے اجتماعی جسم کا ایک بڑا حصہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص کے بدن کا خون چند اعضاء بدن یا ایک عضو میں بند ہو کر رہ جائے اور دُوسرے اعضاء کی طرف گردش نہ کرے تو وہ اعضاء یقیناً مفلوج ہو کر رہ جائیں گے۔ ایک شخص کے لیے خون اور جماعت کے لیے دولت یکساں طور پر مواد حیات ہے۔ قرآن نے پہلے اس بنیادی اصول کا اعلان کیا۔

"لکی لا یکون دولۃ بین الاغنیآء منکم"

"تقسیم سب میں اس لیے ضروری ہے کہ مال صرف اغنیاء کے طبقے میں گردش نہ کرنے پائے۔"

یہ تو اس بنیادی اصول کا اعلان تھا لیکن اسلام نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسلام نے اصلاحِ معاش کے لیے ایسے قوانین نافذ کیے ہیں جن سے حرکت دولت پر عمل ہو۔

اگر ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ عوام غربت و افلاس کا شکار ہوں تو امراء کے پاس اپنی ضرورت سے جس قدر مال زائد موجود ہو وہ قانون استحبابی کے تحت

سب فقرا میں تقسیم ہو۔

اللہ نے اغنیاء پر ضروریاتِ فقرا کو فرض قرار دیا ہے۔ اگر فقرا بھوکے اور ننگے ہوں اور اغنیاء کے نہ دینے سے تکلیف میں پڑ جائیں تو اللہ تعالیٰ ان سے حساب لے گا اور سزا دے گا۔ ضرورت کے وقت اغنیاء سے مال لے کر سب پر برابر تقسیم کیا جائے گا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"جس کے پاس ضرورت سے زائد سواری ہو وہ اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں۔ اور جس کے پاس زادِ راہ زائد موجود ہو وہ اس کو دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی کئی ضروریات کی چیزیں ذکر فرمائیں یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ ہمارے پاس ضرورت سے زائد جو چیز موجود ہو اس میں ہمارا کوئی حق نہیں۔ ابوذر فرماتے ہیں کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔

امراء عوام کے حقوق کو اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ غصب کرتے ہیں اور پھر عوام کی حق رسی نہیں ہوتی۔ لہٰذا حکومت کا ہونا نہ ہونا عوام کے لیے برابر ہو جاتا ہے۔ اسلام نے قانونی حقوق میں مساوات قائم کر کے اس خامی کو دور کیا اور شاہ و گدا کو قانون انصاف کے برابر کر دیا۔ اسلامی تاریخ کے علاوہ کسی دین و آئین میں مساواتِ قانونی کا عملی رنگ موجود نہیں۔ سربراہ مملکت کو ایک معمولی آدمی کے دعویٰ کی جواب دہی کے لیے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔ اور عدالت کا فیصلہ سنتے ہی اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے معاشی نظام میں ایسی اشیاء کو شخصی ملکیت سے مستثنیٰ کر کے مشترک عوامی ملکیت میں شامل کیا جن کا تعلق انسانی جد و جہد اور انسانی سعی و عمل سے نہیں۔ جن کی ضرورت سب عوام کو ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

علویات میں سے آفتاب و ماہتاب اور سفلیات میں سے پانی، آگ، گھاس، نمک خشکی یا آبی شکار مشترک ہیں۔ (ابنِ ماجہ، ہدایہ، کتاب الخراج امام ابو یوسف)

ان مذکورہ اشیاء کے ساتھ سب عوام کا حق متعلق ہے۔ کوئی کسی کو محروم نہیں کرسکتا اور نہ حکومت عوام پر پابندی لگا سکتی ہے۔ اِلّا اس صورت میں کہ عوام کو اس میں نقصان ہو۔ دریا میں سے ہر آدمی کو پانی پینے کا حق ہے۔ جانوروں کو پانی پلانے کا حق ہے۔ نالی کھود کر کھیت سیراب کرنے کا بھی حق ہے۔ اس میں کشتی چلا کر پیسے کمانے کا بھی حق ہے۔ اس کے پانی سے مچھلیاں پکڑنے کا بھی حق ہے۔ اس طرح خود رو گھاس پر ہر آدمی کا حق ہے۔ خواہ خود کاٹے یا اگر مالک زمین کو ضرر ہو تو وہ خود کاٹ کر اس کے حوالے کر دے اسی طرح پہاڑوں سے قدرتی نمک حاصل کرنا ہر آدمی کا حق ہے کہ اس سے استفادہ کرے۔ زمینی سمندری اور دریائی شکار پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ تمام عوام اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ اسی طرح سمندر سے جو جواہرات عنبر و موتی وغیرہ نکلتے ہیں وہ سب کا حق ہے۔

وفی الغایة شرح هدایه فیما فی البحر لا یملك الامام ان یخص واحدا دون واحد۔

"غایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ بادشاہ کا حق نہیں کہ سمندری اشیاء کو کسی کے لیے مختص کر دے۔"

جو غیر مملوکہ زمین شہر سے باہر ہو لیکن شہر والوں کو اس کے جنگل میں سے لکڑی جلانے کی ضرورت ہو یا مویشی چرانے کی، ایسی زمین مشترک رہے گی تاکہ شہری ضرورت اس سے پوری ہو سکے۔ وہ موات کے حکم میں نہیں کہ کوئی فرد اس پر قبضہ کرے اور نہ یہ جائز ہے کہ حکومت وہ کسی کو بطور جاگیر دے۔

وما کان خارج البلد من مرافقها ومحتطبا لاهلها ومعالهم لا یکون مواتا فلا یملك الامام اقطاعها۔

(عنایہ علی الہدایہ ج ۴ ص ۳۵۰)

آبادی کے قریب کھلی زمین عوام کی ملکیت ہے جس میں وہ مویشی چرائیں گے اور کٹی ہوئی فصل رکھیں گے تو ان منافع عامہ کے تعلق کی وجہ سے وہ زمین موات کے حکم میں نہیں۔ وہ کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں بن سکتی۔

جو بوڑھا آدمی کام نہ کر سکے یا اس کو کوئی آفت پہنچے یا امیر کے بعد فقیر ہو جائے کہ بھیک مانگنے لگے تو اس سے جزیہ معاف ہے اور اس کو اور اس کے سارے کنبے کو سرکاری خزانے سے اخراجات دیئے جائیں گے جب تک وہ اسلامی مملکت میں رہے۔ اگر اسلامی مملکت سے نکل جائے تو پھر اسلامی سلطنت پر اس کا خرچ لازم نہیں۔

(کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۸۵)

اسلام چونکہ دین الٰہی ہے۔ اس کی تمام انسانی پہلوؤں پر نظر ہے اس لیے اس نے انسانی انفرادیت کو بھی قائم کیا اور جائز طریقوں سے انسان کو رزق کمانے شخصی ملکیت برقرار رکھنے کی پوری آزادی دی اور کوئی طاقت اس کی فطری آزادی کو سلب کرنے کی مجاز نہیں۔ قرآن پاک کا اعلان ہے:

ان لیس للانسان الا ما سعٰی و ان سعیہ سوف یریٰ۔

"ہر انسان کو اپنے جائز اکتسابِ مال کے لیے سعی کرنے کا حق ہے۔ وہ آزاد ہے۔ اس کی کوشش کا ثمرہ صرف اسی کا حق ہے۔"

بیہقی کی حدیث ہے کہ:

طلب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ اذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ۔

"دینی فرائض کے بعد رزق حلال کمانا بھی انسان پر فرض ہے۔ جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین پر تلاشِ معاش کے لیے پھیل جاؤ۔"

ان ہدایات میں معاشی ضروریات کے لیے سعی و عمل کی دعوت ہے اور عمل بڑا محرک فطرۃً شخصی ملکیت کا تصور اور اختصاص و انفرادیت کا جذبہ ہے۔ اس فطری امر کو اسلام نے برقرار رکھا ہے۔ بلکہ ہدایات کے ذریعہ اس کو عمل پر اُبھارا ہے۔

لیکن انفرادیت کا تقاضا پورا کرنے کے بعد اسلام نے انسان کے اجتماعی پہلو کے متعلق بھی ہدایات دیں اور اجتماعی دائرے سے بھی اس کو آگاہ کیا۔ اسلام نے انسان کو یہ تصوّر دیا کہ پوری انسانیت ایک برادری ہے اور ایک ہی کنبہ ہے اور ایک ہی

محبت رکھی ہے۔ جس کی حکمت یہ ہے کہ اگر انسان میں کلیتہً حُبِ مال نہ ہو تو وہ طلبِ مال چھوڑ دے گا۔ جس سے دنیا کی رونق بھی ختم ہو جائے گی اور چونکہ مال ہی سے انسانی زندگی قائم ہے۔ پس اگر مال نہ ہو تو خود انسان بھی ختم ہو جائے گا۔ یہی فطری محبت ہے جسے قرآن حکیم نے فصیح و بلیغ الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ انسان کو فطرتاً انسانوں میں سے بیویوں اور اولاد سے محبت ہے اور جمادات میں سونے چاندی کے انباروں سے اور حیوانات میں عمدہ گھوڑوں اور مویشیوں سے اور نباتات میں سے کھیت اور فصلوں سے۔

دوسری آیت میں یہ بتایا گیا ہے انسان مال کی محبت میں حد سے زیادہ حریص اور شدید ہے۔ اس لیے معاشی نظام کی درستی کے لیے انسان کے اس نفسیاتی جذبہ کی اصلاح اور اس کو اعتدال پر لانا ضروری ہے جس کے لیے اسلام نے مندرجہ ذیل ہدایات دیں۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ

"یہ مذکورہ چیزیں چند روز فائدہ اٹھانے کا سامان ہیں اور اللہ کے پاس وہ چیز ہے جو انجام حیات کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔"

دوسری آیت میں ارشاد ہوا:۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى

"اس دورِ حیات کے فوائد کو تم ترجیح دیتے ہو اور زندگی کا اصلی آخری دور عمدگی میں دنیا سے بڑھ کر ہے اور پائدار بھی ہے۔"

قرآن چونکہ خدائے جمیل و جلیل کا کلام ہے اس لیے وہ نفسیاتی گُردں سے واقف ہے کہ مال اور دنیوی فوائد کی فطری محبت توڑی نہیں جا سکتی البتہ موڑی جا سکتی ہے۔ اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا امالہ ہو سکتا ہے۔ یعنی اس محبت کا رُخ مال سے ایک بڑے محبوب کی طرف پھیرا جا سکتا ہے۔ اس لیے قرآن نے دنیوی نعمتوں کا اُخروی نعمتوں کے ساتھ موازنہ کیا کہ اُخروی نعمتوں میں بلحاظ انجام حسن ہے لیکن دنیوی نعمتوں کا انجام فنا ہے۔ اُخروی نعمتیں دنیوی نعمتوں سے بہتر ہیں۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کا رُخ دُنیا سے آخرت کی محبوبات کی طرف پھیر کر انسان کی حرص و ہوس کا خاتمہ کر دیا۔ جس سے انسان کی معاشی حالت پر ضرب پڑتی ہے۔

دوسری طرف اسلام نے یہ ہدایت دی کہ انسان کے تمام مفاسد کی جڑ حُبِ دُنیا ہے۔ ظلم وستم، انسانوں کی حق تلفی، چوری، ڈاکہ، سود، رشوت، خیانت اور بے اصولی ان سب کا اصلی سبب حبِ دنیا ہے۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ النازعات کی یہ آیات تلاوت فرمائیں۔

فاما من طغیٰ وآثر الحیٰوۃ الدنیا فان الجحیم ھی الماویٰ

"جس نے ظلم اور سرکشی اختیار کی اور دُوسروں کا حق مارا اور آخرت کی پائدار اور محبوب زندگی پر دُنیائے فانی کی حقیر زندگی کو ترجیح دی تو اُس نے جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنایا۔"

حبِ مال جو انسانی معاشرہ کے لیے منبعِ فساد ہے اس کے ازالہ کے لیے عملی مشق کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے اسلام نے ایسے عملی قوانین عطا کیے کہ انسانی حرص اور حبِ مال اس کی عملی مشق کی وجہ سے مغلوب ہو اور اس میں بنی نوع انسان پر مال صرف کرنے کی عادت پختہ ہو جائے۔ اس کے لیے قانونِ زکوٰۃ کے تحت اموالِ تجارت میں نصاب اور سال گزر جانے کی شرط کے تحت اڑھائی فیصد محتاج طبقہ پر صرف کرنا لازم قرار دیا۔ اسی طرح زمینی پیداوار میں اگر آبپاشی آسان ہو تو اس کا دسواں حصہ اور اگر مشکل ہو تو بیسواں حصہ محتاجین کا لازمی حق قرار دیا گیا۔

اسی طرح مخصوص جرائم کے کفارہ کے لیے قانون نافذ کیا کہ اگر روزہ توڑے یا بیوی کو یہ کہہ دے کہ تو میرے لیے ماں بہن ہے تو ساٹھ محتاجوں کو دو وقت کھانا کھلائے۔ اسی طرح اگر قسم توڑ دے تو اس کے کفارے میں دس محتاجوں کو کھانا یا کپڑا دینا واجب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام نے صدقاتِ نافلہ کی ترغیب دی بلکہ اس میں اس حد تک ہدایت دی کہ جو کچھ ضرورت سے زائد ہو اس کو محتاجوں میں تقسیم کر دو۔

جو بوڑھا آدمی کام نہ کر سکے یا اس کو کوئی آفت پہنچے یا امیر کے بعد فقیر ہو جائے کہ بھیک مانگنے لگے تو اس سے جزیہ معاف ہے اور اس کو اور اس کے سارے کنبے کو سرکاری خزانے سے اخراجات دیئے جائیں گے جب تک وہ اسلامی مملکت میں رہے۔ اگر اسلامی مملکت سے نکل جائے تو پھر اسلامی سلطنت پر اس کا خرچ لازم نہیں۔
(کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۸۵)

اسلام چونکہ دین الٰہی ہے۔ اس کی تمام انسانی پہلوؤں پر نظر ہے اس لیے اس نے انسانی انفرادیت کو بھی قائم کیا اور جائز طریقوں سے انسان کو رزق کمانے شخصی ملکیت برقرار رکھنے کی پوری آزادی دی اور کوئی طاقت اس کی فطری آزادی کو سلب کرنے کی مجاز نہیں۔ قرآن پاک کا اعلان ہے :

ان لیس للانسان الا ما سعٰی و ان سعیه سوف یرٰی۔

"ہر انسان کو اپنے جائز اکتسابِ مال کے لیے سعی کرنے کا حق ہے۔ وہ آزاد ہے۔ اس کی کوشش کا ثمرہ صرف اسی کا حق ہے۔"

بیہقی کی حدیث ہے کہ :

طلب الحلال فریضة بعد الفریضة اذا قضیت الصلوٰة فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل الله۔

"دینی فرائض کے بعد رزق حلال کمانا بھی انسان پر فرض ہے۔ جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین پر تلاشِ معاش کے لیے پھیل جاؤ۔"

ان ہدایات میں معاشی ضروریات کے لیے سعی و عمل کی دعوت ہے اور عمل بڑا محرک فطرۃً شخصی ملکیت کا تصور اور اختصاص و انفرادیت کا جذبہ ہے۔ اس فطری امر کو اسلام نے برقرار رکھا ہے۔ بلکہ ہدایات کے ذریعہ اس کو عمل پر ابھارا ہے۔

لیکن انفرادیت کا تقاضا پورا کرنے کے بعد اسلام نے انسان کے اجتماعی پہلو کے متعلق بھی ہدایات دیں اور اجتماعی دائرے سے بھی اس کو آگاہ کیا۔ اسلام نے انسان کو یہ تصوّر دیا کہ پوری انسانیت ایک برادری ہے اور ایک ہی کنبہ ہے اور ایک ہی

ماں باپ کی اولاد ہے۔

"اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ماں باپ سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور ذاتیں بنائیں۔ تاکہ تم ایک دوسرے کا حق پہچانو۔"

(الحجرات پ ۲۶)

رُوح المعانی ج ۲۶ ص ۱۶۲ میں ہے کہ :۔

"تم ایک دوسرے کو پہچانو اور حق قرابت ادا کرو اور انساب پہچان کر میراث کو اس کے مطابق تقسیم کرو۔ نہ اس لیے کہ تم ایک دُوسرے پر بڑائی جتلاؤ۔"

بیہقی حضرت انس اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً حدیث نقل کرتے ہیں۔

"تمام اولادِ آدم اللہ کا کنبہ ہے۔ اللہ کو سب مخلوق میں وہی محبوب ہے جو اس کنبہ کے ساتھ احسان کرے۔"

انسان ایک روحانی مخلوق بھی ہے۔ اگر اس کو اللہ سے ربط ہو اور نتائج اعمال اور مکافات عمل کا یقین ہو۔ اس کا دل بخل، حرص، تکبر، حب ذات اور حب قوم کی آلائشوں سے پاک ہو تو اس کی اپنی معاشی حالت بھی ٹھیک ہوگی۔ اور دوسرے انسانی افراد کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ اور کوئی دوسرا انسان اس کے ظلم کا شکار نہ ہوگا۔ لیکن اگر خود انسانی روح ناپاک ہو تو اس کا وجود دوسرے انسان کے لیے وبال ہوگا اور ہر وقت دوسرے انسان اس کے جانی و مالی مظالم کا تختہ مشق بنتے رہیں گے۔ قوانین خواہ اچھے ہوں یا بُرے اُن کو نافذ کرنے والا بہرحال انسان ہی ہوگا۔

جب انسان کی روحانیت بگڑی ہوئی ہو تو قوانین چاہے عادلانہ ہوں وہ کیا کر سکتے ہیں۔ قرآن فرماتا ہے۔

"کامیاب ہوا وہ انسان جو رُوح کو پاک کرے اور ناکام ہے وہ انسان جس نے اغراض و مصالح دنیوی کی گندگی سے رُوح کو آلودہ کیا۔"

انسان کے نفسیاتی پہلو کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انسان میں مال کی

انسان کو اس لحاظ سے بھی دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کل کائنات کا ایک اہم جزو ہے اور جزو ہونے کے لحاظ سے بھی اس کے فرائض ہیں۔ وہ یہ کہ وہ کائنات کے لیے موجب تخریب بھی ہے اور باعث تعمیر بھی۔ اس سے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد یہ ہے کہ :۔

تم اس نادان عورت کی طرح مت بنو جو اپنی محنت سے مضبوط کاتے ہوئے سوت کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ (پ ۱۴)

انسان کلیتہً آزاد نہیں۔ وہ کائنات کے حاکم اعلیٰ کے ماتحت ہے۔ اس کے ہاتھ میں جسقدر معاشی اور غیر معاشی نعمتیں ہیں وہ اسی حاکم اعلیٰ کی امانت ہیں اور اسی کے حکم کے تحت حاصل کی جائیں گی اور اسی کے حکم کے تحت صرف ہونگی۔ اسلیے اس نے اکتساب مال پر پابندی لگادی ہے تاکہ سرمایہ دارانہ مفاسد پیدا نہ ہوں۔ مال حلال ذریعہ سے حاصل کیا جائے حرام ذریعہ سے نہیں تاکہ سرمایہ دارانہ طغیان وسرکشی پیدا نہ ہو۔ اس لیے اُس نے وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ یعنی تم ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ، کہہ کر باطل کمائی کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ خواہ استعمار ہو، استحصال بالجبر ہو، رشوت وسود ہو، ظلم، خیانت چوری ہو۔

یہ قانون اسلام کی اکتسابی تحدید ہے۔ مجموعۂ دولت چونکہ مجموعۂ افراد انسانی کا ذریعہ معاش ہے۔ اگر ایک انسانی طبقہ ناجائز ذرائع سے مال بڑھائے گا تو دوسرے طبقے میں اسی تناسب سے مال کی کمی پیدا ہوگی۔ کیونکہ ناجائز ذرائع کا استعمال دو انسانوں کے درمیان ہے۔ انسان اور غیر انسان کے درمیان نہیں۔ جب ایک طبقہ کے پاس ناجائز دروازے سے مال آئے گا تو جس انسان کے ساتھ اس نے ناجائز معاملہ کیا اس کے پاس مال کی کمی پیدا ہوگی اور معاشی توازن بگڑ جائے گا۔

اسلام نے دوسری تحدید و پابندی مال خرچ کرنے پر لگائی کہ وہ ناجائز کاموں میں صرف نہ ہو جو تبذیر ہے اور نہ بے ضرورت خرچ ہو جو اسراف ہے بلکہ خرچ میں اعتدال قائم رکھا جائے۔

ولا تبذر تبذیراً ان المبذرین کانوا اخوان الشیطین

وکان الشیطٰن لربہ کفوراً۔

"تم ناجائز کاموں میں مال صرف نہ کرو کہ ایسے لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان خدا کی نعمت کا ناشکر گزار ہے۔"

دیکھیے! قرآن نے اس جرم کے لیے کس قدر سخت الفاظ استعمال کئے ہیں:

ولا تجعل یدک مغلولۃً الیٰ عنقک ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوماً محسوراً۔ (پ ۱۵)

"تم خرچ کے وقت نہ ہاتھوں کو گردن کے ساتھ باندھے رکھو کہ ضرورت پر بھی خرچ نہ کرو اور نہ بہت پھیلا کر رکھو کہ غیر ضروری اشیاء پر خرچ کرنے لگ جاؤ۔ پہلی صورت میں بخل کا الزام لگ کر رسوا اور ملامت زدہ ہو جاؤ گے اور دوسری صورت میں خود غریب اور درماندہ ہو جاؤ گے۔"

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

الاقتصاد نصف المعیشۃ

"خرچ میں میانہ روی آدھی معیشت کو درست کرنا ہے۔"

دوسری یہ حدیث بھی حضرت ابوذر غفاری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

البذاذۃ من الایمان

"سادہ زندگی ایمان کی علامت ہے۔"

خود حضور علیہ السلام اور صحابۂ کرام نے سادہ زندگی گزاری۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ رشد و ہدایت کے فریضہ سے غافل نہ ہوئے جبکہ ان ہدایات کی حکمت یہ ہے کہ جب مال بے محل اور ناجائز و بے جا صرف ہوگا تو غریب طبقہ کی خبرگیری کیسے کر سکے گا۔ محتاجوں پر خرچ کرنے کے لیے اس کا ہاتھ خالی ہوگا۔ اسلام چاہتا ہے کہ دولت کا رُخ بے جا محل سے موڑ کر کارِ خیر اور اشاعتِ دین کے کاموں کی طرف متوجہ کر دے اور یہی چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے معاشی حالت میں بھی توازن پیدا ہوگا اور نیکی بھی پھیلے گی۔ جس سے دنیا بھی سدھرے گی اور آخرت بھی۔

اسلام نے تقسیمِ دولت کے ایسے قوانین عطا کیۓ جن سے زندگی میں بھی دولت زیادہ سے زیادہ متحرک اور مرنے کے بعد بھی۔ زندگی میں قانون خمس، قانون زکوٰۃ، قانون عشر، قانون کفارات، قانون صدقۃ الفطر، قانون اداء نذور، اعطاء سائل و محروم ایسے قوانین ہیں جس سے دولت تقسیم ہو کر متحرک ہو جاتی ہے۔

قرآن نے اعلان کیا :-

نحن قسمنا بینھم معیشتھم

"روٹی کی تقسیم ہم نے کی ہے"

اسلامی نظام معاشی دَور میں نووی شرح مسلم میں تصریح کی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز مال کے لیے لوگوں کو بلاتے تھے لیکن کوئی نہ آتا تھا۔ لوگ اس قدر خوشحال اور فارغ البال تھے۔

تقسیمِ رزق کام تھا خدا کا۔ جب انسانِ ناقص نے اس کو اپنے ہاتھ میں لیا تو انسان بھوکے مرنے لگے۔ ابتری و بے چینی پھیلی جس کا اصلی سبب خالقِ کائنات سے انسان کے تعلق کا منقطع ہونا ہے اور مادہ و مادیات سے وابستہ ہونا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

"خوب سُن لو کہ صرف اللہ کی یاد اور تعلق سے انسان کو چین اور اطمینان نصیب ہو سکتا ہے"

سرمایہ داری اور اسلام

اسلامی نظریۂ تقسیم دولت جو اصول پچھلے باب میں بیان کیے گئے ہیں، اُن کی روشنی میں کائنات کی تمام اشیاء اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ پھر ان اشیاء میں سے ایک کثیر حصہ تو وہ ہے جسے اس نے وقف عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دے دیا ہے۔ آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، خودرو گھاس اور غیر مملوکہ بنجر زمین وغیرہ اسی قسم میں داخل ہیں جن پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں بلکہ وہ وقفِ عام ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ان کا مساوی طور پر حق دار ہے۔

دوسری طرف بعض اشیاء وہ ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیے بغیر وہ قابل عمل اور فطری نظامِ معیشت قائم نہیں ہو سکتا جس کی طرف ہم نے تقسیمِ دولت کے پہلے مقصد میں اشارہ کیا ہے۔ اشتراکی نظام کو اختیار کرتے ہوئے تمام سرمایہ اور زمین کو کلیتہً حکومت کے حوالے کر دینے کا نتیجہ مآل کار اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چھوٹے چھوٹے بیشمار سرمایہ داروں کو ختم کر کے ملکی دولت کے عظیم الشان ذخیرے کو ایک بڑے سرمایہ دار کے حوالے کرنا پڑتا ہے جو من مانے طریقے پر دولت کے اس ذخیرہ سے کھیلتا ہے۔ جس کا نتیجہ بدترین ارتکازِ دولت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے دوسری بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسانی محنت چونکہ اپنے اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے اس لیے اس کے استعمال کے لیے جبر و تشدد ناگزیر ہے۔ جس کا اثر محنت کی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے اور اس کی ذہنی صحت پر بھی۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اشتراکی نظام میں اسلامی نظریہ تقسیمِ زر کے دو مقاصد مجروح ہوتے ہیں۔ ایک فطری نظمِ معیشت

کا قیام اور دوسرے حقدار کا حق پہچاننا۔ اُس کو اس کا حق پہنچانا۔ جبکہ اسلام نے انفرادی ملکیت کو سرے سے ختم کر ڈالنا پسند نہیں کیا بلکہ کائنات کی جو اشیاء وقفِ عام نہیں ہیں ان میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرکے اس نے سرمایہ اور زمین کی جداگانہ حیثیت برقرار رکھی ہے۔ اور ان میں رسد و طلب کے فطری نظام کو بھی صحت مند بنا کر استعمال کیا ہے۔ اسلام میں تقسیمِ دولت صرف اُجرت کی شکل میں نہیں ہوتی بلکہ منافع اور کرایہ کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اُس نے سود کی مَد کو ختم کرکے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست بنا کر ارتکازِ دولت کی اس زبردست خرابی کو بھی ختم کر دیا ہے جو سرمایہ داری کا خاصہ لازمہ ہے۔

اسلام کے نظریۂ تقسیمِ دولت کے مذکورہ بالا امتیازات میں سب سے بڑا اور بنیادی امتیاز یہ ہے کہ اس نے آجر اور سرمایہ کی تفریق ختم کر دی ہے۔ جس کے نتیجے میں تقسیمِ دولت کے تین مد قرار پائے ہیں۔

۱۔ منافع

۲۔ اُجرت

۳۔ کرایہ

اسلام نے سود کو ناجائز قرار دے دیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں آجر کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی بنا پر اسے منافع کا مستحق قرار دیا گیا ہے، یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ کاروبار کے نفع و نقصان کا خطرہ برداشت کرتا ہے۔ گویا سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے منافع اس کی اس ہمت کا صلہ ہے کہ اس نے ایک ایسی کاروباری مہم کا آغاز کیا جس میں اگر نقصان ہو جائے تو وہ تنِ تنہا اسی پر پڑے گا۔ باقی تینوں عوامل پیدا وار میں سے سرمایہ کو معین سود، زمین کو معین لگان اور محنت کو معین اُجرت مل جاتی ہے۔ اس لیے وہ نقصان سے بری ہیں۔ اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ درحقیقت نقصان کا خطرہ مول لینے کی یہ صفت خود سرمایہ دار میں موجود ہونی چاہیے۔ اس خطرے کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ جو شخص کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے اسی کو یہ خطرہ مول لینا پڑنے

گا۔ اس لیے جو سرمایہ دار ہے وہی خطرہ مول لینے کے لحاظ سے آجر بھی ہے اور جو شخص آجر ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔ اب سرمایہ کے کسی کاروبار میں لگنے کی درج ذیل صورتیں ہیں۔

سرمایہ لگانے والا بلا شرکت غیرے خود ہی کاروبار بھی چلائے۔ اس صورت میں اس کو جو صلہ ملے گا وہ عرفی اور قانونی اعتبار سے صرف منافع کہلائے گا۔ لیکن معاشی اصطلاح کے مطابق وہ صلہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوگا۔ سرمایہ لگانے کی وجہ سے منافع کا اور کاروبار چلانے کی محنت کے لحاظ سے اُجرت کا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کئی آدمی مل کر سرمایہ لگائیں۔ کاروبار چلانے میں بھی سب شریک ہوں اور نفع نقصان میں بھی، اسے فقہی اصطلاح میں "شرکت العقود" کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی معاشی اصطلاح کے مطابق تمام شرکا سرمایہ لگانے کی حد تک منافع کے حق دار ہوں گے اور کاروبار چلانے کی حیثیت سے اُجرت کی یہ صورت بھی اسلام نے جائز قرار دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل تجارت کا یہ طریقہ رائج تھا۔ آپ نے لوگوں کو اس پر برقرار رکھا اور اس جواز پر اجماع منعقد ہو گیا۔

(المبسوط۔ السرخسی۔ ص ۱۵۱۔ ج ۱۱)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے شام میں اسلام اور سرمایہ داری پر ایک تقریر کرتے ہوئے لوگوں سے کہا۔

"لوگو! یہ میری نہیں قرآن کی تعلیم ہے۔ میں وہی کہتا ہوں جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ دولت سرمایہ داروں کے گرد گردش نہیں کرتی رہنی چاہیئے۔ اور حکمرانوں کے پاس جمع ہونی چاہیئے کہ عوام بھوک اور پریشانی کی زندگی گزاریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں سرمایہ داروں کی حرکات اور عادات کا کھل کر اظہار کیا ہے اور ایسے لوگوں کے نام مستکبرین اور مترفین رکھا ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ اسلام کے راستے میں رکاوٹ بنے ہیں یا پھر اپنی خواہشات کے پیش نظر اسلام کا نام لے کر اپنی ذاتی خواہشات کو پورا کیا ہے اور غریب عوام کی معاشی پریشانیوں میں مبتلا کر کے اپنی حکومت

کے طول و عرض کو پھیلایا ہے۔ ایسے غریبوں اور ناداروں کا نام قرآن نے مستضعفین اور مساکین رکھا ہے۔ ایسے لوگوں کی معاشی حالت سدھارنے پر اسلام نے پوری قوت سے زور دیا ہے اور دولت کو عوام میں تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مقصدِ حیات کو فراموش کر دیا ہے اگر کچھ لوگوں نے اسلامی انقلاب کے لیے کوشش کی تو علماء اور مسلمانوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ عام علماء نے ایسی ہر کوشش کو دبانے کی سعی کی ہے لیکن ہمیشہ انقلابِ اسلام کا راستہ کھلتا رہا ہے اور آج بھی کھلا ہے۔

مختلف آبادیوں کے جو اموال بطور فئے کے حاصل ہوں وہ صرف اللہ اور رسول، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہیں۔ یہ حکم اس لیے ہے تاکہ دولت مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے بلکہ معاشرہ میں مالی توازن قائم رہے۔ لہذا رسول جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو، جو نہ دے اس سے باز رہو۔ تقویٰ شعار بنو۔ یاد رکھو خدا کا عذاب نافرمانوں کے لیے بڑا ہی سخت ہے۔

اے لوگو! اسلام بنیادی طور پر اس کے خلاف ہے کہ دولت جماعت کے اندر چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے۔ اس کے برعکس اسلام کا منشا یہ ہے کہ جماعت کے مختلف اوضاع میں ایک قسم کا ایسا اعتدال پیدا کر دے کہ ملت میں مکمل توازن قائم رہے اور دولت صرف دولت مند لوگوں ہی میں گردش نہ کرتی رہے کیونکہ ایک جہت میں مال و دولت کے انبار جمع ہو جانا اور دوسری جہت سے بالکل سمٹ جانا بہت بڑے اجتماعی مفاسد کا باعث بن جاتا ہے جس سے جماعت کے مختلف طبقات میں حسد، کینہ اور بغض و عناد کے جذبات پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے اموال بھی ہیں جن سے مفادِ عام وابستہ ہوتا ہے

اور افراد کے لیے ان کو کسی جہت سے بھی اپنے لیے مخصوص کر لینا جائز نہیں۔ لہٰذا اسلام میں انفرادی ملکیت کی طبیعی حقیقت کا خلاصہ یہ قانون ٹھہرا کہ مال عموماً جماعت کی ملکیت ہے اور انفرادی قبضہ مالکانہ نہیں بلکہ محض وکالتاً ہے جس کے لیے بہت سی شرطیں اور پابندیاں ہیں۔

نیز بعض اموال کا شمار اموال عامہ میں ہو گا۔ جن پر کسی شخص کی انفرادی تحویل بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان انفرادی تحویلوں کا بھی ایک حصہ ایسا ہے جو جماعت کا حق ہے اور جماعت اس حصہ کو افراد سے واپس لے کر ان طبقات پر خرچ کر دیتی ہے جنہیں اس کی ضرورت ہو تاکہ وہ اپنی حالت کو درست کر سکیں اور ان کی حالت کی درستگی سے جماعت کی مجموعی حالت درست ہو سکے۔

حکومت الٰہی میں خلیفۃ اللہ کے سامنے خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا ہے۔ وہ اس کے لیے نہ اپنے بزرگ ساتھیوں کے ساتھ کسی قسم کا ترجیحی سلوک کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے اور نہ محض جذباتی امور سے متاثر ہو کر عام مفاد کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا عطیہ مفاد عامہ کے پیش نظر بلال رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی سے واپس لیا جا سکتا ہے تو دیگر نااہل لوگوں کے پاس سے بیکار زمین یا ان کی ضرورت سے زیادہ زمین واپس لینے میں کیسے غور و فکر کی گنجائش نکل سکتی ہے اور اس میں حقوق ملکیت کا گورکھ دھندا کیسے حائل ہو سکتا ہے۔"

مضاربت

اسلام میں کاروبار کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص سرمایہ لگائے اور دُوسرا کاروبار چلائے اور نفع میں دونوں شریک ہوں۔ اسے فقہی اصطلاح میں مضاربت کہتے ہیں۔

اس صورت میں معاشی اصطلاح میں سرمایہ لگانے والے "رب المال" کو اس کا حصہ نفع کی صورت میں ملے گا اور کاروبار چلانے والے "مضارب" کو اُجرت کی صورت میں۔ ہاں اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو جس طرح رب المال کا سرمایہ بے کار گیا اسی طرح مضارب کی محنت بیکار گئی۔ یہ صورت بھی اسلام میں جائز ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح سے قبل یہی معاملہ فرمایا تھا۔ (شرح المواہب۔ زرقانی۔ ص ۱۹۸۔ ج ۱)

اس کے بعد اس کے جواز پر بھی فقہاء امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ ان صورتوں کے سوا کاروبار میں سرمایہ کے شریک ہونے کی اسلام میں کوئی اور صورت نہیں ہے۔ البتہ غیر اسلامی معاشروں میں شغل سرمایہ کی جو صورت شروع سے رائج چلی آتی ہے سود کا کاروبار ہے۔ یعنی ایک شخص سرمایہ بطور قرض دے۔ دُوسرا محنت کرے۔ نقصان ہو تو محنت کا ہو اور سرمایہ کا سود ہر صورت میں کھرا رہے۔ اس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

"اے ایمان والو! سود میں جو کچھ باقی رہ گیا ہو، اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ

سُن لو۔" (۲ : ۲۷۸)

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

"پس اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہیں تمہارے اصل اموال مل جائیں گے نہ تم کسی پر ظلم کرو۔ نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔" (۲ : ۲۷۸)

ان دو آیتوں میں پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات صاف کر دی ہے کہ سود کی ادنیٰ سے ادنیٰ مقدار کا باقی رہنا بھی اللہ کو گوارا نہیں ہے اور سود کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ قرض دینے والے کو صرف راس المال واپس ملے۔

جاہلیت میں بعض قبائل عرب دوسرے قبائل سے سود پر قرض لے کر کاروبار کرتے تھے۔ اسلام نے ان تمام معاملات کو یکسر موقوف کر دیا۔ ابن جریج کہتے ہیں:

"جاہلیت میں بنو عمرو بن عمیر بنو المغیرہ سے سود لیا کرتے تھے اور بنو مغیرہ انہیں سود دیتے تھے۔ جب اسلام آیا تو ان کا ان پر بہت سا مال واجب تھا۔"

واضح رہے کہ قبائل عرب کی حیثیت مشترکہ کمپنیوں کی سی تھی جو افراد کے مشترک سرمایہ سے کاروبار کرتی تھیں۔ اس لیے ایک قبیلے کا اجتماعی طور پر قرض لینا عموماً کاروبار کیلئے ہوتا تھا۔ اس کو بھی قرآن کریم نے ممنوع قرار دے دیا۔

غرض اسلامی نظام معیشت میں جو شخص کسی کاروباری آدمی کو اپنا روپیہ کاروبار میں لگانے کو دینا چاہتا ہے۔ اسے پہلے یہ متعین کرنا ہوگا کہ وہ اس روپیہ سے اس کاروباری آدمی کی امداد کرنا چاہتا ہے۔ اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ روپیہ دے کر کاروبار کے نفع سے مستفید ہو تو اسے شرکت یا مضاربت کے طریقوں پر عمل کرنا پڑیگا۔ یعنی اسے کاروبار کے نفع و نقصان کی ذمہ داری بھی اُٹھانا پڑے گی۔ کاروبار میں نفع ہوا تو وہ نفع میں شریک ہوگا اور اگر کاروبار میں خسارہ ہوا تو اسے خسارے میں بھی حصہ دار ہونا پڑے گا۔

اور اگر وہ روپیہ دوسرے کی امداد کی غرض سے دے رہا ہے تو پھر ضروری ہے

کہ وہ اس امداد کو امداد ہی سمجھے اور نفع کے ہر مطالبے سے دستبردار ہو جائے۔ وہ صرف اتنے ہی روپے کی واپسی کا مستحق ہوگا جتنے اُس نے قرض دیئے تھے۔ اسلام کی نظر میں اس ناانصافی کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں وہ اپنے سود کی ایک شرح معین کر کے نقصان کا بوجھ مقروض پر ڈال دے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ اسلام میں نقصان کا خطرہ مول لینے کی ذمہ داری سرمایہ پر ہے۔ جو شخص کاروبار میں سرمایہ لگائے گا اسے یہ خطرہ ضرور مول لینا پڑے گا۔ اگر کسی شخص نے قرض حسنہ لے کر کاروبار میں سرمایہ لگایا اور دائن کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ نہیں کیا تو قرض لینے کے بعد مدیون خود اس روپے کا مالک ہو گیا۔ اب وہ خود سرمایہ دار کی حیثیت سے روپیہ لگا رہا ہے۔ اس لیے نقصان کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوگی۔

لہٰذا اگر آجر کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خطرہ مول لیتا ہے تو یہ خصوصیت اسلام کی نظر میں درحقیقت سرمایہ کی ہے۔ اس لیے اسلام نظام معیشت میں سرمایہ اور اصطلاحی آجر ایک ہی چیز ہو جاتے ہیں۔ اور تقسیمِ دولت میں ان کا حصہ منافع ہے نہ کہ سود۔ اور اگر آجر کی بنیادی خصوصیت یہ سمجھی جائے کہ وہ تنظیم اور منصوبہ بندی کرتا ہے تو پھر یہ کام محنت میں داخل ہے اور اسے عامل پیداوار سمجھنا درست نہیں۔

اسلام کی رُو سے منافع اور اُجرت جائز ہے اور سود ناجائز۔ اب ایک چیز کرایہ رہ جاتی ہے اسلام نے اسے بھی جائز قرار دیا ہے۔ معیشت کے مادی وسائل دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جنہیں استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ بلکہ وہ اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ دیتے ہیں اسی فائدہ کی اُجرت کو اسلام کرایہ کہتا ہے۔

اس کے برخلاف نقد روپیہ وہ چیز ہے جس سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے اسے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے کسی قسم کا فائدہ تک نہیں اٹھایا جا سکتا جب تک کہ اس سے کوئی چیز خریدی نہ جائے۔ لہٰذا روپیہ چونکہ بذاتِ خود قابلِ استفادہ نہیں ہوتا، اس لیے

ایک طرف تو اس سے جس قسم کا فائدہ مقروض اٹھانا چاہے، اسے خرچ کر کے خود کچھ عمل کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف مقروض کے استعمال کی وجہ سے روپیہ کی قدر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس لیے اس پر کوئی معین شرح سود مقرر کرنے میں کوئی معقولیت نہیں۔ روپیہ کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو قرض نہ دے یا چاہے تو اس کے ذریعہ روپے کے حاجت مند کے ساتھ شرکت و مضاربت کا کاروبار کرے۔ لیکن اگر وہ قرض دیتا ہے تو اس پر معین شرح سے سود لینے کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اسی بنا پر جو چیزیں بذاتِ خود خرچ کیے بغیر قابل استفادہ نہیں ہوتیں وہ سرمایہ کہلائیں گی۔ اور جب وہ عامل پیداوار کی حیثیت سے کاروبار میں شریک ہوں گی تو منافع کی مستحق ہوں گی۔

اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیمِ دولت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشیات میں سود جائز ہے اور اسلام میں ناجائز۔ یوں تو سود کی حُرمت سے پیدائش دولت کے نظام پر بھی بڑے گہرے، دور رس اور مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

احادیث میں فریقین کی رضامندی کے باوجود جو "تلقی الجلب" "بیع الحاضر والباد" "محاقلۃ" "مزابنہ" اور "مخابرہ" وغیرہ کی شدید ممانعت ہے۔ قدیم رسم تھی کہ سرمایہ دار لوگ دیہات کے غلہ کو بازار میں آنے سے پہلے دیہات میں پہنچ کر خرید لیتے اور ذخیرہ کر کے گراں فروشی کرتے۔ قیمت میں من مانی زیادتی کرتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع فرمایا۔ اسی کا نام تلقی الجلب ہے۔

اور "بیع الحاضر والباد" "محاقلۃ" "مزابنہ" اور "مخابرہ" کے معنی یہ ہیں کہ جاہلی دَور میں عرب میں آڑھت کا کام کرنے والے دیہات کا غلہ اپنے پاس ذخیرہ کر کے گراں قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ اس کے انسداد کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر والوں کو گاؤں والوں کا دلال بننے سے منع فرمادیا۔ کیونکہ یہ تینوں قسمیں بیع فاسد کی تھیں جن میں ایک فریق کو نقصان کا خطرہ رہتا۔ اس کو بھی باوجود رضامندئ فریقین منع کر دیا گیا۔

سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف موجودہ دنیا میں جو شدید ردعمل ہوا ہے اس کی بہت

بڑی وجہ آجر اور اجیر کے جھگڑے اور اُجرتوں کے تعین کے مسائل ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بنیاد ہی چونکہ خود غرضی اور بے لگام انفرادی ملکیت پر ہے۔ اس لیے اس نظام میں آجر اور اجیر کے درمیان رسد و طلب کا ایک ایسا رسمی تعلق ہے جس کی بنیاد خالص خود غرضی پر استوار ہے۔ آجر صرف اس حد تک اجیر کی انسانیت کا احترام کرتا ہے جب تک وہ اپنے کاروبار کے لیے اس کے ہاتھوں مجبور ہے۔ لہٰذا جہاں یہ مجبوری ختم ہوئی وہاں وہ اس پر اپنے ظلم کا شکنجہ کس دیتا ہے۔ دوسری طرف اجیر صرف اس وقت تک آجر کے کام اور اس کے احکام سے دلچسپی رکھتا ہے جب تک اس کا روزگار کسی اجر پر موقوف ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور اور مالک میں ایک مستقل کش مکش جاری رہتی ہے اور دونوں کے درمیان کوئی صحت مند رابطہ قائم نہیں ہو پاتا۔

اسلام نے آجر و اجیر کے درمیان رسد و طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے لیکن ساتھ ہی محنت کی رسد و طلب دونوں پر کچھ پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ ان کا باہمی رابطہ ایک خشک رسمی تعلق نہیں رہتا بلکہ بڑی حد تک بھائی چارہ بن جاتا ہے۔ آجر کا نقطۂ نظر اجیر کے بارے میں وہی ہونا چاہیئے جو قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کے ایک مقولے کے حوالے سے قرآن حکیم نے بیان کیا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے آجر تھے۔ انہوں نے فرمایا:

وما ارید ان اشق علیک ستجدنی ان شاء اللہ من الصالحین۔

"میں تم پر (غیر ضروری) مشقت ڈالنا نہیں چاہتا۔ خدا نے چاہا تو تم مجھے نیکو کار پاؤ گے۔"
(۲۸ : ۲۷)

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ ایک مسلمان آجر جس کی اصل منزلِ مقصود صالح ہونا ہے اس وقت تک صالح نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اجیر کو غیر ضروری مشقت سے بچانے کا داعیہ نہ رکھتا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مزید واضح الفاظ میں اس طرح فرمایا:

ان اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم ما یغلبھم فاعینوھم۔

"تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے زیر دست کیا ہے۔ لہٰذا جس شخص کا بھائی اس کے ماتحت ہو اسے چاہیئے کہ وہ جو خود کھائے اسی میں سے اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے اسی میں سے اس کو بھی پہنائے اور ان پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو اور اگر کسی ایسے کام کا بوجھ ڈالو تو خود ان کی مدد کرو۔"

نیز ارشاد فرمایا۔

اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ

"مزدور کی اُجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔"

[صحیح بخاری کتاب العتق ص ۳۴۶۔ ج اوّل
جمع الفوائد۔ ابنِ ماجہ وطبرانی ص ۲۵۶
الاجارہ بروایت ابوہریرہؓ۔ ص ۳۰۲۔ ج اوّل]

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کا میں قیامت کے دن دشمن ہوں گا ان میں سے ایک وہ ہے جو کسی مزدور کو اُجرت پر لے، پھر اس سے کام پورا لے اور اس کو اُس کی اُجرت نہ دے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزدوروں کے حقوق کا جس قدر احساس تھا اس کا اندازہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اس روایت سے ہوتا ہے جس میں آپ فرماتے ہیں :

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم

"نماز کا خیال رکھو اور ان لوگوں کا جو تمہارے زیر دست ہیں۔"

ان ہدایات سے مزدور کو اسلامی معاشرے میں جو مقام اور برادرانہ مقام حاصل ہوا اس کی

بے شمار مثالیں قرونِ اولیٰ کی اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں اور پورے وثوق و یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ مزدور کے حقوق کی رعایت اس سے بہتر طریقے پر ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف اسلام نے اجیر کو بھی کچھ احکام کا پابند بنا کر آجر سے اس کے تعلقات کو مزید خوشگوار کر دیا۔ مزدور آجر کے جس کام کی ذمہ داری اُٹھاتا ہے اسلامی نقطہ نظر سے وہ ایک ایسا معاہدہ کرتا ہے جس کی پابندی اسے صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لیے نہیں کرنی ہے بلکہ اس کی اصل منزل مقصود یعنی آخرت کی بہتری بھی اسی پر موقوف ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

یاایھا الذین اٰمنوا اوفوا بالعقود۔

"اے ایمان والو! تم اپنے معاہدوں کو پورا کرو۔"

ان خیر من استاجرت القوی الامین

"بہترین اجیر وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔"

(جمع الفوائد۔ ابنِ ماجہ)

نیز ارشاد ہے:

"دردناک عذاب ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے جو اپنا حق لینے کے وقت پورا پورا وصول کریں۔ اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دینے کا موقعہ آئے تو کمی کر جائیں۔"

فقہا امت کی تصریحات کے مطابق اس آیت میں "تطفیف" یا ناپ تول میں کمی کرنے والے کے مفہوم میں وہ مزدور بھی داخل ہے جو طے شدہ اُجرت پوری وصول کر کے بھی کام چوری کا مرتکب ہو اور اپنے جو اوقات اُس نے آجر کو بیچ دیئے ہیں انہیں آجر کی مرضی کے خلاف کسی اور کام میں صرف کرے۔ اس لیے ان احکام نے کام چوری کو گناہ قرار دے کر اجیر کو بھی متنبہ کر دیا ہے کہ جس آجر کا کام کرنا اُس نے قبول کیا ہے اس کی ذمہ داری اُٹھا لینے کے بعد اب وہ خود اس کا اپنا کام بن گیا ہے اور اس کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ پوری دیانت داری، مستعدی اور لگن کے ساتھ اسے

انجام دے۔ ورنہ وہ آخرت کی اس بہتری کو حاصل نہ کر سکے گا جو اس کا اصل منتہائے مقصود ہے۔

اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اگر وسیع نظر سے دیکھا جائے تو اس کی اخلاقی ہدایات بھی درحقیقت قانونی احکام ہیں۔ اس لیے کہ ان پر بالآخر آخرت کی جزا و سزا مرتب ہوتی ہے جس کو ایک مسلمان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ عقیدہ آخرت ہی وہ چیز ہے جس نے نہ صرف اخلاق کو قانون کا درجہ دیا ہے بلکہ اصطلاحی قوانین کی پشت پناہی بھی کی ہے۔ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جو درس دیئے ان میں بیشتر اسی موضوع پر مبنی تھے۔

تقسیمِ دولت کی ثانوی مدّات

اسلامی نظریۂ تقسیمِ دولت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے معاشرہ کے کمزور عناصر کو قوی کرنے اور بیکار افراد کو قابلِ کار بنانے کے لیے عاملین پیداوار کے ساتھ دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست دی ہے اور اس کا ایک باقاعدہ نظام بنایا ہے۔

اسلام میں دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے۔ وہی اس کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور اسی نے انسان کو اس ملکیت کے حقوق عطا کئے ہیں۔ انسان کو اس کے کسب و عمل کا جو بھی صلہ ملتا ہے وہ اس مالک کا ضرور ہے لیکن چونکہ کسب و عمل کی تمام تر تخلیق کی توفیق اللہ ہی دیتا ہے اور دولت کی تخلیق بھی اسی نے کی ہے۔ اس لیے انسان اپنی ملکیت کے استعمال میں قطعی طور پر خود مختار نہیں ہے بلکہ اللہ کے احکام کا پابند ہے۔ لہٰذا جس جگہ وہ خرچ کرنے کا حکم دے وہاں خرچ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اسی بنیادی نظریے سے عملِ پیدائش کے علاوہ استحقاقِ دولت کا ایک دوسرا مد خود بخود نکل آتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ہر وہ شخص دولت کا مستحق ہے جس تک دولت کا پہنچانا اللہ نے دولت کے اولیں مالکوں کے ذمے فرض قرار دیا ہے۔ اس طرح تقسیمِ دولت کے ثانوی مدات کی ایک طویل فہرست مرتب ہو جاتی ہے جن میں سے ہر ایک دولت کا مستحق ہے۔

ان مدات کو مقرر کر کے اسلام درحقیقت یہ چاہتا ہے کہ دولت کو معاشرے میں زیادہ سے زیادہ گردش دی جائے۔ اور ارتکازِ دولت پر جو پابندیاں سود کی حرمت

کے ذریعہ عائد کی گئی ہیں انہیں مزید توسیع دی جائے۔ اور وہ مدات حسب ذیل ہیں۔

زکوٰۃ

اُن میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ وسیع مد "زکوٰۃ" ہے۔ قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر اس فریضے کو نماز کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ہر وہ شخص جو سونے چاندی مویشی اور مال تجارت کا مقدار نصاب کی حد تک مالک ہو اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ سال گزرنے پر اپنی مملوکات کا ایک حصہ دوسرے ضرورت مند افراد پر صرف کرے اور جو شخص اس فریضے کو ادا نہ کرے اس کے لیے قرآن کریم کا ارشاد یہ ہے۔

"جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کر رکھتے ہوں اور اسے اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو آپ دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔ جس دن اس (دولت) کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا۔"

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے قرآن کریم نے آٹھ مصارف مقرر کر کے دولت کی زیادہ سے زیادہ گردش کا دروازہ کھول دیا ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف میں وجہ استحقاق کی قدر مشترک ناداری اور افلاس ہے۔ اس طریقے سے نادار اور مفلس افراد کے درمیان زکوٰۃ تقسیم ہوتی ہے۔

عُشر

عشر درحقیقت زمینی پیداوار کی زکوٰۃ ہے۔ لیکن اس پیداوار میں انسانی محنت کا دخل نسبتاً کم ہوتا ہے اس لیے اس کی شرح ۲٫۵ فیصد کے بجائے ۱۰ فیصدی رکھی گئی ہے۔

عشر صرف ان زمینوں کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق عشری ہوں۔ اور اس کو زکوٰۃ ہی کے مصارف پر خرچ کیا جاتا ہے۔

کفارات

معاشرہ کے کمزور افراد تک دولت پہنچانے کا ایک مستقل راستہ اسلام نے کفارات کے ذریعہ مقرر کیا ہے۔ کوئی شخص بلا عذر رمضان کا روزہ توڑ دے یا کسی مسلمان کو بلا عمد قتل کر دے یا اپنی بیوی سے ظہار کر لے یا قسم کھا کر اسے توڑ دے تو بعض صورتوں میں لازمی اور بعض صورتوں میں اختیاری طور پر اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال کا حصہ ناداروں پر خرچ کرے۔ یہ نقد روپیہ کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور کھانے کپڑے کی صورت میں بھی۔

صدقۃ الفطر

جو لوگ صاحبِ نصاب ہوں ان کے لیے عید الفطر کے موقع پر لازم کیا گیا ہے کہ نمازِ عید کو جانے سے پہلے فی کس پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت مفلسوں، ناداروں، یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کریں۔ رقم نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی نکالی جاتی ہے اور اس کے لیے مقدارِ نصاب کا نامی ہونا یا اس پر پورا سال گزرنا بھی ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اس فریضے کا دائرہ زکوٰۃ سے بھی زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ خاص طور سے ایک اجتماعی مسرت کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا چار مدات غریبوں اور مفلسوں میں دولت تقسیم کرنے کے لیے تھے۔ اس کے علاوہ دو مدّوہ ہیں۔ جن سے اعزہ و اقربا کی امداد اور ان تک دولت کا پہنچانا مقصود ہے ان میں سے ایک مدّ نفقات کی ہے اور دوسری وراثت کی۔

نفقات

اسلام نے ہر انسان پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اپنے خاص خاص رشتہ داروں

کی معاشی کفالت کرے۔ پھر ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کی کفالت بہر صورت واجب ہے۔ خواہ انسان تنگ دست ہو یا خوشحال مثلاً بیوی، اولاد اور بعض وہ ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری وسعت کے ساتھ مشروط ہے۔ ایسے رشتہ داروں کی ایک طویل فہرست اسلامی فقہ میں موجود ہے اور اس کے ذریعہ خاندان کے اپاہج، کمزور و نادار افراد کی معاشی کفالت کا بڑا اچھا نظام بنایا گیا ہے۔

وراثت

اسلام کا نظام وراثت اس سے کے نظریہ تقسیم دولت میں ایک بنیادی امتیاز رکھتا ہے۔ وراثت کی مرتکز تقسیم سے تقسیم دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

اسلام نے تقسیم وراثت کا جو نظام بنایا ہے اس میں قرابت کے لحاظ سے وارثوں کی ایک طویل فہرست رکھی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے متروکہ دولت زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ دولت کے وسیع پھیلاؤ کے پیشِ نظر یہ حکم دیا جا سکتا تھا کہ سارا ترکہ غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے یا بیت المال میں داخل کر دیا جائے لیکن اس صورت میں ہر مرنے والا کوشش کرتا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں سارا مال ختم کر جائے۔ اس سے معیشت کے نظام میں ابتری پیدا ہو جاتی۔ اس لیے اسلام نے اسے میت کے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کا نظام بنایا ہے جو مالک سرمایہ کی فطری خواہش ہے۔ دُنیا کے تمام نظام ہائے وراثت کے برخلاف عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

> "مردوں کے لیے (بھی) ایک حصہ ہے۔ اس مال میں جو والدین اور اقربا چھوڑ کر جائیں اور عورتوں کے لیے بھی ایک حصہ ہے۔ اس مال میں جو والدین چھوڑ کر جائیں، تھوڑے میں سے بھی اور زیادہ میں سے بھی ایک معین حصہ ہے۔"

مرنے والے کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی وارث کو محروم کر دے یا کسی کے حصے میں ترمیم کر سکے۔ اس طرح وراثت کے راستے سے ارتکازِ دولت کا امکان ختم کر دیا گیا ہے۔

ارشاد ہے۔

"تمہارے باپ بیٹوں میں کون نفع کے اعتبار سے تم سے قریب تر ہے تم نہیں جانتے۔ یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے"۔

چھوٹی اور بڑی اولاد میں کوئی تفریق نہیں کی گئی بلکہ سب کو برابر حصہ دیا گیا ہے۔

کسی وارث کے لیے اس کے حصہ رسدی کے علاوہ کسی مال کی وصیت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اس طرح کوئی وارث متوفی کے مال سے اپنی وراثت کے سوا کچھ نہیں پا سکتا۔

متوفی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ وارثوں کے سوا دوسرے لوگوں کے لیے وصیت کر جائیں۔ اس سے بھی دولت کے پھیلاؤ میں مدد ملتی ہے اور تقسیم وراثت سے قبل دولت کا ایک حصہ وصیت پر صرف ہو جاتا ہے۔

خراج و جزیہ

مذکورہ بالا مدات کے علاوہ دو مدّیں ایسی ہیں جن میں مالکانِ دولت کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ حکومتِ وقت کو ادا کریں۔

خراج کی ایک قسم زمینی لگان ہے۔ جو صرف ان زمینوں پر عائد کیا جاتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق خراجی ہوں اور اس کو حکومت اجتماعی کاموں میں صرف کر سکتی ہے اور جزیہ ایک تو ان غیر مسلم افراد سے وصول کیا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کے باشندے ہوں۔ اور حکومت نے ان کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا ہو۔ دوسرے ان غیر مسلم ممالک سے بھی جزیہ وصول کیا جا سکتا ہے جن سے جزیہ کی ادائیگی پر صلح ہوئی ہو۔ یہ رقم بھی حکومت کے اجتماعی مقاصد میں صرف ہوتی ہے۔

اوپر تقسیم دولت کے جو قانونی مدات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ سب وہ ہیں جن میں دولت

صرف کرنا دولت کے اولیں مالکوں کے ذمہ شخصی طور پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ غرباء و مساکین پر اور مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں خرچ کرنے کی جو ترغیبات قرآن و سنت میں وارد ہوئی ہیں وہ ان کے علاوہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

"لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں۔ آپ فرما دیجئے کہ جو بچ رہے۔"

اس ارشاد نے واضح فرما دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ انسان صرف مقدار واجب خرچ کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ جس قدر دولت اس کی ضرورت سے زائد ہو۔ وہ سب معاشرے کے ان افراد تک پہنچانے کو اپنی سعادت سمجھے جو دولت سے محروم ہیں۔ قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "انفاق فی سبیل اللہ" کے احکام سے بھرے ہوتے ہیں۔

پیشہ ورانہ گداگری کا انسداد

معاشرہ کے کمزور افراد کو سرمایہ داروں کے اموال میں حق دلانے سے دُوسری طرف معاشرہ میں خرابی کے امکانات تھے کہ معاشرہ کا یہ طبقہ مفلوج ہو کر ہمیشہ قوم پر بار بنا رہے۔

شریعت اسلام نے اس پر بھی گہری نظر کر کے ان کو بھی خاص قانون کا پابند بنایا۔

تندرست و توانا آدمی کو بجز مخصوص حالات کے سوال کرنے کا حق نہیں دیا۔

قرآن کریم نے فقراء کی قابل تعریف صفت یہ بیان فرمائی ہے۔

"وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔"

جس شخص کے پاس ایک دن کے گزارہ کا سامان موجود ہو اس کے لیے سوال کرنا حرام ہے۔

غرباء و مساکین کو اس کی ترغیب دی کہ محنت مزدوری کی کمائی کو عزت سمجھیں۔ صدقات سے گریز کریں۔

محکمہ احتساب کے ذریعہ گداگری کا انسداد کیا گیا۔

ان تحریکات کا ایک عظیم محرک ہونے کی صورت میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ایک عظیم انسان تھے۔ اسلام اور شعائر اسلام ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھے۔ ان کے

بغیر ایک لمحہ بھر زندہ رہنا اُن کے لیے محال تھا۔ آپ نے کئی بار قرآن حکیم کی زبان میں فرمایا۔

"اے لوگو! تم پر تمہارے اپنے نفس کی ذمہ داری ہے۔ اگر تم ہدایت پاؤ گے تو دُوسرا گمراہ ہونے والا تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہر نفس جو کچھ کماتا ہے اس کا بوجھ اسی پر ہے۔ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ اگر تم نیک کام کرو گے تو اپنے نفس کے لیے کرو گے اور اگر بُرے کام کرو گے تو اسی کے لیے۔"

اور اسی حقیقت کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ

پھر اس بات کو قرآن مجید نے آخرت کے ذکر میں بڑی کثرت سے بیان فرمایا ہے کہ اللہ کی عدالت میں ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت سے پیش ہوگا اور اسی حیثیت سے اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھے گا۔ یعنی جس طرح ہر فرد کی شخصیت انفرادی ہے اور ذمہ داری انفرادی ہے۔ اسی طرح اس کا نتیجہ اور انجام بھی آخر کار انفرادی ہی ہے۔

نظریۂ کنز

امر بالمعروف و نہی عن المنکر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا خاص شیوہ تھا سچائی کے اعلان میں دُنیا کی کوئی قوت آپ کو روک نہیں سکتی تھی۔ حتیٰ کہ خود امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ فرمایا کرتے:

"اللہ کی باتوں میں ملامت کرنے والوں کے طعنوں سے نہ ڈرنے والا صرف ابوذر رضی اللہ عنہ رہ گیا ہے۔"

جو روشنی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو مشکوٰۃ نبوت سے ملی تھی۔ اس روشنی کو عام کرنے میں آپ کبھی تساہل نہ کرتے تھے۔ جب موقع ملتا اسی فکر و عمل میں مصروف رہتے۔

جب آپ شام تشریف لائے تو یہاں بھی آپ نے وعظ و درس کا باب کھول دیا۔ اشاعتِ سنتِ محمدیہ میں منہمک ہو گئے۔ آپ کے مواعظ کے بعض بلیغ فقرے تاریخوں میں اب تک محفوظ ہیں۔ مثلاً البلاذری نے نقل کیا ہے۔ شام میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے۔

"خدا کی قسم! میں دیکھ رہا ہوں کہ سچائی مٹ رہی ہے۔ جھوٹ زندہ کیا جا رہا ہے۔ سچے جھٹلائے جا رہے ہیں۔ بغیر تقویٰ کے لوگ خود غرضیاں اختیار کر رہے ہیں۔" (البلاذری ص۵۶ ج ۵)

اسی ضمن میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے مسئلہ کنز کی بھی تبلیغ کی۔ کھانے پینے اور سامان زندگی کے علاوہ ہر ایک قسم کے مال کو جمع کرنے کو کنز کہتے ہیں۔

(زرقانی۔ شرح المواہب)

جو لوگ کنز کے مرتکب تھے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ان کو دھمکاتے، ڈراتے اور فرماتے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ سونا چاندی پر گرہیں لگاتے ہیں وہ شعلے بن کر اُن سے لپٹیں گے جب تک کہ اسے خدا کی راہ میں صرف نہ کر دیں۔"

کبھی بیان کرتے:

"کانزین، سونا چاندی جمع کرنے والوں کو مژدہ سُنا دو کہ جہنم کی آگ میں تپائی ہوئی تختیاں ان کے سینے پر رکھی جائیں گی حتیٰ کہ وہ سینہ توڑ کر کندھوں کی ہڈیوں سے نکل جائیں گی۔"

کبھی فرماتے:

"مالدارو! غریبوں کی مدد کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو لوگ سونا چاندی سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو۔
اُس دن وہی سونا چاندی آگ میں گرم کئے جائیں گے پھر ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پشت اس سے داغے جائیں گے اور کہا جائے گا یہ وہی ہے جسے اپنے فائدے کے لیے تم نے اکٹھا کر رکھا ہے۔ پس چکھو اس چیز کو جسے تم جمع کرتے تھے۔"

اور پھر آپ قرآن کریم کی آیت کی تلاوت کرتے:

والذین یکنزون الذهب والفضة ولا ینفقونها فی سبیل الله فبشرهم بعذاب الیم۔ یوم یحمیٰ علیها فی نار جهنم

الغرض مسجدوں اور بازاروں میں آپ کا یہی بیان ہوتا رہا۔ موخرین کا بیان ہے کہ اس

واقعہ سے عام طور پر دمشق میں برہمی پھیل گئی۔ غربا۔ اُمرا کو تنگ کرنے لگے۔ آپ کے مواعظہ حسنہ نے ہلچل مچادی۔ طبری میں ہے:

حتی و لع الفقرآء لمثل ذٰلك و اوجبوه علی الاغنیآء

(تاریخ طبری)

"غربا اس قسم کی باتوں سے دلچسپی لینے لگے اور سرمایہ داروں پر اس کو واجب کر دیا کہ جو کچھ ان کے پاس ہو خرچ کر دیں۔"

مختلف لوگوں نے آپکے افکار وارشادات کی مختلف شرح کی ہے۔ عام طور پر اکثر علمار کی یہی رائے ہے کہ آپ ہر ایک قسم کے مال کو جمع کرنا حرام سمجھتے تھے۔ حافظ ابوعمرو بن عبدالبر کہتے ہیں۔

"ابوذر رضی اللہ عنہ سے بکثرت ایسی باتیں منقول ہوئی ہیں جو بتاتی ہیں کہ کھانے پینے اور سامان زندگی کے علاوہ ہر ایک قسم کے مال جمع کرنے کو کنز کہتے ہیں۔ اور اس کے مرتکب کی مذمت کرتے تھے۔ اور قائل تھے کہ وعید کی آیت قرآن مجید میں ان لوگوں کے لیے نازل ہوئی ہے۔"

حافظ ابن حجر اور قاضی عیاض نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے نظریۂ کنز کے مطلب کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

قاضی عیاض کا خیال ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ عام طور پر ہر شخص کے لیے اس کو حکم نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کی دھمکیاں ان بادشاہوں اور شہریاروں سے مخصوص تھیں جو رعایا سے دولت سمیٹ کر محض اپنے عیش ونشاط اور جاہ وجلال میں صرف کرتے تھے۔ اور جن لوگوں کے واقعی حقوق تھے ان کو محروم رکھتے تھے۔

حافظ ابن حجر کا خیال ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا مطلب دراصل یہ نہ تھا کہ خود اپنے مال کے جمع کرنے میں بھی انسان داغا جائے گا۔ بلکہ آپ کا یہ فتویٰ ان لوگوں کی حد تک محدود تھا جو دوسروں کا مال جمع کرتے تھے۔

حافظ ابن حجر نے ایک اور توجیہ بیان کی ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ خاص کر سونا چاندی

کو جمع کرنے کی چیز نہ سمجھتے تھے علاوہ ان نقدین کے آپ کسی اور چیز کے جمع کرنے کو منع نہیں فرماتے تھے۔ (فتح الباری شرح البخاری)

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مطلب یہ تھا کہ اگر درہم و دینار ضرورت سے زیادہ ہیں تو ان کو فوراً کسی مفید چیز کی صورت میں بدل دیا جائے تاکہ ایک مفید جائداد ہو جائے جو روزمرہ کی ضرورتوں میں کام آئے۔ مثلاً اس سے زمین خرید لی جائے۔ مویشی لے لیے جائیں جن سے دودھ کا فائدہ ہو۔ گدھے، اونٹ، گھوڑے وغیرہ لے لیے جائیں تاکہ ان سے بار برداری اور سواری میں آرام ملے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سونے کے زیور کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ نہیں چاہتے تھے کہ سونا زیور کی صورت میں مقید ہو جائے۔ کیونکہ مسند میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک اعرابی آیا۔ مجلس میں ابوذر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ اعرابی نے کہا۔

"ہم لوگوں کو قحط کھا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"۔

اس کے جواب میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"میں اس وقت سے ڈر رہا ہوں جب تم لوگوں پر دُنیا خوب اچھی طرح بہائی جائے گی (یعنی وہ اس قحط سے زیادہ خطرناک ایام آزمائش ہوں گے)"

اور اس کے بعد نہایت حسرت سے آپ نے ارشاد فرمایا۔

فیالیت امتی لا یتحلون الذھب

"کاش میری اُمت سونے کا زیور استعمال نہ کرتی"۔

اس روایت سے گو سونے کی حُرمت مطلقاً نہیں ہوتی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی تمنا یہی تھی کہ میری امت سونے کا استعمال نہ کرتی۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ میں جذب کی جو کیفیت تھی اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس منشار نبوت نے ان میں کس اثر کو پیدا کر دیا ہوگا۔ بعض ارباب فتاوی کی رائے

یہ ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ اگر طلائی زیوروں کو حرام نہیں تو کم از کم ناپسند ضرور خیال فرماتے تھے۔ خود آپ کے ذاتی قول و عمل سے اس کا پتہ چلتا ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اس کے ہوتے ہوئے دوسروں کی باتیں ظاہر ہیں کہ کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ مثلاً معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی تنخواہ سے سال بھر کی ضرورت کی چیزیں خرید لینے کے بعد باقی روپوں کے پیسے بھنا لیتے تھے۔ جب شام سے آپ کے اہل و عیال واپس ہوئے تو ان کے پاس سے ایک کیسہ برآمد ہوا۔ لوگوں کو اس بات پر حیرت ہوئی۔ اس پر آپ کی بیوی صاحبہ نے فرمایا کہ قسم خدا کی اس میں اشرفیاں اور درہم نہیں ہیں بلکہ پیسے ہیں جنہیں ابوذر رضی اللہ عنہ کے لیے بھنا لیا کرتے تھے۔

حلیہ میں اسی قسم کی ایک روایت اور ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی صاحبہ کو دیکھا۔ ان پر ایک ادنیٰ برقعہ پڑا ہوا تھا۔ چہرہ کا رنگ جھلسا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک قفہ (خشک کدو کا تونبا) تھا۔ وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں۔

"ابا جان! کاشت کاروں اور کسانوں کا خیال ہے کہ آپ کے پیسے جو اس قفہ میں ہیں ضرورت سے زائد ہیں۔"

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں فرمایا۔

"بیٹی اس کو اپنے پاس رکھو۔ الحمد للہ کہ تمہارے باپ نے کبھی کسی رات کو اس حال میں دن نہیں کیا کہ وہ سونا چاندی کا مالک ہو۔ تھوڑے سے پیسے اتفاقی ضرورتوں کے لیے اپنے پاس ضرور رکھتا ہوں۔"

آپ کے پاس گدھیاں اور گدھے بھی تھے جو بار برداری میں کام آتے۔ آپ کے پاس اونٹ بھی تھے جن پر علاوہ سواری کے پانی لایا کرتے تھے۔

(تاریخ طبری)

آپ کی ملک میں زمین بھی تھی۔ خواہ بصورت کھیتی یا باغ۔ خود آپ سے روایت ہے:

"جو شخص اونٹ یا گائے بکری کا مالک ہے اور اس کی زکوٰۃ ادا نہیں
کرتا قیامت کے دن اس کے جانور لائے جائیں گے۔ وہ اپنے مالک
کو سینگوں سے ماریں گے۔ پاؤں سے روندیں گے اور جب تک
حساب کتاب کا معائنہ ختم نہ ہو جائے یہ اسی طرح کرتے رہیں گے۔ جب
ایک قطار ختم ہو جائے گی دوسری لوٹے گی"

(مسند احمد)

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ مویشیوں کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو پھر ان کے
رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مسند احمد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت ہے جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ آپ سونا چاندی کو بلا وجہ گاڑنے یا جمع کرنے کے خلاف تھے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ
فرماتے ہیں کہ مجھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا۔

"اے ابوذر! سمجھو اس کو جو میں کہتا ہوں قطعاً ایک بکری جو کسی مسلمان کو
حاصل ہو یہ اس سے بہتر ہے کہ اُحد کے برابر اس کے پاس سونا ہو، پھر
اپنے بعد اس کو چھوڑ جائے"

عرب میں خصوصاً آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ اونٹ اور بکریاں تھیں۔ اس لیے آپ نے بکری
کا ذکر فرمایا۔ ورنہ بظاہر ذکر اس کا یہی ہے کہ زر کو آمدنی پیدا کرنے والی نفع بخش چیزوں
میں لگا دینا زیادہ مفید ہے بہ نسبت اس بات کے کہ زر کو زر ہی کی شکل میں مقید کر کے
کہیں دفن کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر کو پھر مخاطب کر کے فرمایا۔

"ابوذر اس کو سمجھو جو میں کہتا ہوں کہ گھوڑوں کی پیشانی میں قیامت تک
کے لیے برکت رکھی گئی ہے۔ گھوڑوں کی پیشانی میں برکت ہے"

ارباب حدیث جانتے ہیں کہ اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ خیر اور آمدنی
کا بڑا ذریعہ گھوڑا ہے یعنی مسلمان اس وقت تک فارغ البال ہیں جب تک وہ جہاد
کرتے رہیں گے جس کی تعبیر گھوڑے سے کی گئی کہ عرب سپاہیوں کی سب سے اہم شے

جنگ کے لیے گھوڑے ہی تھے۔

مسئلہ کنز نے رفتہ رفتہ اتنی اہمیت حاصل کی کہ حکومت دمشق اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ کامل ابن اثیر میں ہے کہ امیر شام نے کسی کو ایک ہزار اشرفیاں دیکر رات کو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا۔ اشرفیاں لے کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے صبح ہونے سے پہلے ارباب استحقاق میں ان کو تقسیم کر دیا۔ امیر شام نے صبح کی نماز کے بعد اسی شخص کو بلایا جو اشرفیاں لے کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تھا اور اُس سے کہا۔

"تم ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے کہنا کہ مجھے مصیبت سے نجات دلائیے۔ مجھ سے بڑی سخت غلطی ہو گئی۔ امیر شام نے کسی دوسرے آدمی کے پاس یہ اشرفیاں بھیجی تھیں غلطی سے میں آپ کو دے گیا۔"

وہ آدمی گیا اور جو اس سے کہا گیا تھا اُس نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہہ دیا تو آپ نے فرمایا۔

"حاکم شام سے کہنا کہ تمہاری اشرفیاں تو صبح ہونے سے پہلے خرچ ہو گئیں"

اس طریقہ سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا امتحان لیا گیا تھا کہ وعظ و نصیحت صرف دوسروں تک ہے یا خود بھی اس پر عامل ہیں۔

یہی نہیں ابوذر رضی اللہ عنہ کی اور بھی کئی آزمائشیں کی گئیں۔ انہیں کئی بار آزمایا گیا لیکن شکوہِ دین کے دلدادہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے ہر بار درہم و دینار کے انباروں کو ٹھکراتے ہوئے جادۂ حق کو نہ چھوڑا۔ ان کے پیش نظر تو اپنے آقا کا فرمان تھا۔!

"الفقرُ منی والفقرُ فخری"

انقلابی ابوذر رضی اللہ عنہ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی تبلیغ واشاعت نے دمشق وشام میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔جس کی اشد ضرورت تھی۔خلافت میں ملوکیت کے کچھ کچھ آثار نظر آنے لگے تھے۔

اسلامی دعوت انقلاب اور قرآنی انقلابی منشور کے حوالے سے انقلاب قرآن کا ایمان باللہ ہے۔جہاد فی سبیل اللہ ہے۔جس کا دوسرا نام اسلامی واصلاحی انقلاب ہے۔ ایک عقیدہ ہے دوسرا شاہراہ عمل ہے۔ایک نصب العین ہے دُوسرا مسلک ہے، دونوں لازم وملزوم ہیں۔ایک اگر ناقص ہے تو دوسرے میں بھی کچھ نہیں تمام آسمانی کتابیں اور زندگی کے تمام صالح فلسفے انہی دونوں اصولوں کی شرح ہیں۔

اور وہ شرح مختصر پیرائے میں یہ ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کی کشمکش (Struggle for Existence) کا عمل دن رات جاری وساری ہے۔یہ عمل تعمیری بھی ہے اور تخریبی بھی۔تعمیری کم تخریبی زیادہ۔دُنیا میں زندگی کی بنیاد تھی تو موافقت پر لیکن اس کو مخالفت پر قائم کر دیا گیا۔ہر بڑی قوم چھوٹی قوم کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے زندگی اور موت کے ہنگامے میں وہی قوم زندہ رہے گی جسے زندہ رہنا آتا ہوگا اور یہی زندہ رہنے کا فطری ضابطہ بھی ہے۔ بقائے اصلح (Survival of the Fi ttest) یعنی کمزور کا مٹ جانا اور طاقتور کا باقی رہنا ہی فطری ضابطہ اور فطری انتخاب (Natural Selection) ہے۔جس کا اساسی میثاق شریعت کی زبان میں کلمہ طیبہ ہے۔جو ایک ایسا حربہ ہے جس سے مسلمان ہر خوف وخطرہ میں اپنی حفاظت کر سکتے ہیں

یہ حربہ وہ عصائے موسوی ہے کہ اگر ہاتھ میں ہو تو کسی سامری کے طلسمی سانپ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

اسلام سے پہلے انسانیت کے پاس کوئی ایسا حربہ موجود نہ تھا جو کمزور کو طاقتور اور مظلوم کو ظالم کی تباہ کاریوں سے بچا سکے۔ اسلام آیا تو اسلامی انقلاب وجود میں آیا۔ جس نے دُنیا کی ہر طاقتور قوم کو للکارا کہ ایک طاقتور قوم کو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں کمزور قوم پر مسلح یا غیر مسلح جارحیت کا کوئی حق نہیں۔ شاہین کی طرح چٹانوں پر بسیرا کرنا اور سنسناتی آندھیوں میں اُڑنا زندگی کی ایک اعلیٰ ترین علامت ضرور ہے لیکن شاہین کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ اپنا خون گرم کرنے کو پلٹ جھپٹ کر چڑیا کا خون پی جائے اور نہ ہاتھی کے لیے واجب ہے کہ طاقت کا پہاڑ ہونے کے زعم میں چیونٹی کو کچل ڈالے۔

اسلام کی اس للکار نے جابر و قاہر قوتوں پر سناٹا طاری کر دیا کہ اسلام ایک عظیم و جلیل قوت کا نام ہے۔ ہر قوم ہر انسان کو کشمکش حیات میں زندہ رہنے کے گُر سکھاتی ہے۔ برتر زندگی کے اسرار و رموز بتاتی ہے۔ زندگی کے ارتقا میں کمزور رہ جانا اسلام کے نزدیک نہایت معیوب ہے۔ زمین پر رینگنے والے جانور کی طرح زندگی رینگ کر گزارنا اسلام کو انتہائی طور پر ناپسند ہے۔ وہ زندہ رہنے کی صلاحیتوں کا سب سے زیادہ قائل ہے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ زندہ رہنے کے لیے دوسروں کو زندہ نہ رہنے دو۔

اسلام کمزور کو طاقتور ہی نہیں بناتا بلکہ طاقت کو استعمال کرنے کے صحیح طریقے بھی بتاتا ہے۔ اسلام اندھے کی لاٹھی ہی نہیں اس کی اندھی آنکھوں کی بصارت بھی ہے۔ بہرے کی سماعت ہی نہیں بلکہ ایسی مقدس آواز ہے جو دن میں پانچ مرتبہ اس کے کانوں میں گونجتی ہے۔ اسلام کسی فطری انتخاب (Natural Selection) کا تابع نہیں بلکہ اس کا انتخاب ہی فطری انتخاب ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اتنی واضح حقیقت ابھی تک گمراہوں کی سمجھ میں نہ آئی ہو کہ اُن کی آنکھیں ہی نہیں سینوں میں دھڑکتے دل بھی اندھے ہو جاتے ہیں۔

اسلام صلح و آشتی کا سب سے بڑا حامی ہے۔ مصالحت اور موافقت کا خواہاں ہے۔

جیو اور جینے دو کا نقیب ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ قوموں کے درمیان باہمی ربط کی کوئی ایسی شکل پیدا ہو جائے کہ دُنیا سے جنگ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔

اسلام کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ دُنیا کے تمام انسان ایک مرکز پر جمع ہو کر ایک برادری، ایک عالمی معاشرہ، ایک عالمی ریاست قائم کر لیں۔ جس میں امن اور بین الاقوامی انصاف کے سارے دعووں کے باوجود کمزور قوموں کے حقوق پر پڑنے والے ڈاکے نہ پڑیں۔ جس میں نسلی تفاخر اور قومی برتری کو کوئی اہمیت نہ دی جائے اور پھر اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ سب کچھ اسلامی انقلاب کے رونما ہونے ہی سے ہو سکے گا۔

اسلامی انقلاب عمل کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ پوری کائنات کا پیغام ہے۔ زندگی میں حرارت و حرکت اسی جذبہ کا نام ہے۔ ہر لحظہ خوب سے خوب تر کی تلاش اسی انقلاب کا فیضان ہے۔ جو قوم ولولۂ انقلاب کھو دیتی ہے، کھو جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ جس قوم نے جہاد کو چھوڑ دیا زندہ نہ رہی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اسی جہاد کے ایک عظیم مجاہد تھے۔ کیونکہ جہاد ہی وہ عمل ہے جس سے انقلاب جنم لیتا ہے۔ اس اعتبار سے سب کے سب انبیاء علیہم السلام انقلابی لیڈر تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے خدا پرست انقلابی لیڈر۔

لیکن جو چیز دُنیا کے انقلابیوں اور خدا پرست انقلابیوں کے درمیان ایک خطِ امتیاز کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے انقلابی خواہ کتنے ہی نیک نیت کیوں نہ ہوں عدل و توسط کے صحیح مقام کو نہیں پا سکتے۔ وہ یا تو خود مظلوم طبقوں سے اُٹھتے ہیں یا ان کی حمایت کا جذبہ لے کر اُبھرتے ہیں اور تمام معاملات کو انہی طبقوں کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نظر غیر جانبدار نہیں ہوتی۔ وہ ظلم کا ایسا علاج سوچتے ہیں جو نتیجۃً جوابی ظلم ہوتا ہے ان کے لیے متوازن اجتماعی نظام قائم کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

لیکن انبیاء علیہم السلام خواہ کتنے ہی ستائے ہوئے ہوں ان کی شخصی تحریک میں شخصی ردعمل نہیں ہوتا۔ وہ براہ راست خدا کی ہدایت کے تحت کام کرتے ہیں۔ وہ سفاکانہ قوم پرستی کے قائل نہیں ہوتے۔ وہ ایک عادلانہ نظام قائم کرنے آتے ہیں اور تمام

انسانوں کو حق کی دعوت دیتے ہیں۔ لہٰذا اسلام اس انقلاب کے لیے کسی ایک قوم یا گروہ کو نہیں بلکہ پوری انسانیت کو دعوت عمل دیتا ہے۔ اسلامی انقلاب اصلاحی انقلاب ہے۔ تعمیری انقلاب ہے۔ اسلام کی دعوت توحید ایک اجتماعی انقلاب کی دعوت ہے۔ یہ دعوت جو لوگ بھی قبول کر لیں وہ خواہ کسی طبقے، کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک کے ہوں یکساں حقوق اور مساویانہ حیثیت سے اسلامی جماعت کے رکن بن جاتے ہیں۔ اس طرح وہ بین الاقوامی پارٹی وجود میں آتی ہے جسے قرآن حکیم حزب اللہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ حزب اللہ ہی کے ایک سرگرم رکن تھے۔ خدا کی جماعت کے سپاہی۔ یہ جماعت جو انقلاب لاتی ہے تعمیری انقلاب (Constructive Revolution) ہوتا ہے۔ تخریبی انقلاب (Destructive Revolution) نہیں ہوتا۔ اس میں تیغ آزمائی اور کشور کشائی کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ اس انقلاب کا مقصد گھیراؤ جلاؤ، قتل و غارت، توڑ پھوڑ، لوٹ کھسوٹ، تخریب کاری، دہشت گردی، غنڈہ گردی ہرگز نہیں۔ ایسے انقلاب کے عناصر ترکیبی احتسابی تو ہو سکتے ہیں عذابی نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف احتساب کریں گے عذاب نہیں دیں گے۔ ایسا انقلاب فرسودہ اور پراگندہ نظام حیات کی جگہ ایک نیا صالح نظام حیات پیش کرتا ہے۔ اور یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا انقلاب ماضی کی ہر چیز کو مٹا دیتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ایک تعمیری اور اصلاحی انقلاب تو اصولاً صرف ان چیزوں کو مٹاتا ہے جو مٹانے کے قابل ہوتی ہیں۔ وہ ماضی کا انکار نہیں کرتا۔ وہ تو انسانی تاریخ کے سارے باقیات و صالحات کو برقرار رکھتا ہے کہ ان کا باقی رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ انقلاب ہمیشہ مادی یا صنعتی صورت میں ہو انسان کی ذہنی و نفسی زندگی میں بھی ہو سکتا ہے دُنیا میں آج تک جتنے بھی بڑے بڑے انقلاب آئے ہیں وہ سب ذہنی و نفسی انقلاب تھے اور ان کے موجد خدا پرست انقلابی تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا کے سب سے بڑے خدا پرست انقلابی تھے۔ اسلامی انقلاب میں جس نے مشرق سے مغرب تک دھرتی کے ڈانڈے بدل دیئے۔ ایک

اہم ترین اور عظیم ترین نقش تھے۔ آپ نے سالہا سال بہ نفسِ نفیس اپنے اصحاب کی اس انداز اور نہج سے تربیت فرمائی کہ انہوں نے بھی اسلامی انقلاب میں اہم ترین نقوش چھوڑے۔ درحقیقت آپ کی تدریس نے اس دنیا کے سب سے بڑے تعمیری انقلاب کی بنا رکھی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اسی انقلاب کی ایک کڑی تھے۔ حوزۂ علمیہ صفہ میں جو درس انہیں دیا گیا تھا آخری دم تک اسی درس و دعوت کی تبلیغ کرتے رہے۔ آپ کے بلند اور انقلابی افکار اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی دعوت و تبلیغ کو بغاوت سمجھا گیا۔ انقلاب اسلامی کے پیرو داعی پر شدائد و مصائب کے دروازے کھول دیئے گئے۔

دُنیا کا یہ خاصا ہے کہ ہمیشہ زمانہ کے ذہین و دانشمند افراد پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہے اور ان کی مخالفت پر کمربستہ رہتی ہے اور ہمیشہ ان کو جاں گُسل محرومیوں، مصائب و آلام، اور طرح طرح کی پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا کرتی رہتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ یہ جبر فطرت اور قہر و غلبہ فلسفۂ آفرینش اور راز خلقت کے برخلاف نہیں۔ اور حکمت و مصلحت سے خالی نہیں۔ جیسا کہ تاریخ اسلام کے انقلابی چہرہ حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔

> ”خداوند علیم مردان جری کو فتنہ میں ڈالتا ہے اور اس طرح اُن کے روحانی جوہر کی آزمائش کرتا ہے تاکہ پتہ چلے کہ بُردبار اور صابر کون ہے اور یہ کہ پرہیزگار اور پاک دامن کون ہے۔ تاکہ بندہ کو محشر کے دن خداوند عالم پر کسی قسم کی حجت نہ ہو۔ اور کوئی شخص بھی بغیر پوچھ گچھ کی آزمائش کے ایک قدم نہ بڑھ سکے۔“

زمانہ کے مردان جری ہمیشہ رنج و محن، تنہائی، بیگانگی، بےکسی اور فتنہ و آشوب سے جنگ کرتے ہوئے یہ کڑوے کسیلے گھونٹ پیتے رہے تاکہ مسلسل جد و جہد کرتے رہیں اور اس لیے بھی کہ استاد تقدیر اور معلم روزگار کے ہاتھوں ان کا جوہر ذات وجود نکھر جائے اور ان کی پُرآشوب زندگی میں جو شدائد و مصائب اور ناسازگار حالات و واقعات درپیش آئیں تو وہ ان میں تحمل و بردباری اور استقامت کے اظہار کے لیے آمادہ ہوں۔

مصالح ملکی کو دیکھتے ہوئے حکومت شام نے منادی کرادی کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں کوئی شریک نہ ہو۔ ان کے ساتھ کوئی نہ بیٹھے۔ (طبقات ص۱۷۶)

جس وقت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ملی کہ مجھ سے مقاطعہ کا حکم دیا گیا ہے تو اگر کوئی آپ کے پاس آکر بیٹھتا تو اسے منع فرماتے اور کہتے۔

"حکومت کا حکم ہے کہ میرے پاس کوئی نہ بیٹھے۔ دیکھو تم اُٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتا۔"

ابن خلدون کا بیان ہے کہ فتنہ پردازوں کی ایک جماعت اس حکم مقاطعہ کے بعد آپ کے پاس آئی اور آپ کو حکومت کے خلاف اُبھارنا چاہا۔ لیکن آپ نے ان کی ایک نہ سنی۔ ان لوگوں کو نکال دیا۔ (ابن خلدون ص ۱۲۷)

البلاذری نے انساب میں صراحۃً یہ بیان کیا ہے کہ ان فتنہ پردازوں کو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے یہ فرما کر نکال دیا۔

"میں فتنہ سازی میں کسی کا ساتھ نہیں دُوں گا۔ تمہارا کلام اور ہے میرا پیام اور ہے۔"

یہ سن کر فتنہ پردازوں نے اپنی راہ لی۔ اس پر بھی آپ پر زبان بندی کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ آپ گوشہ نشین ہو گئے۔ لیکن اس کا کوئی علاج نہ تھا کہ لوگ دُور دُور سے آپ کی زیارت کے لیے جوق در جوق چلے آتے۔ آپ ان کو لاکھ منع فرماتے تھے لیکن آپ میں روحانی کشش تھی لوگوں کو کھینچ کھینچ کر آپ کے قدموں میں ڈال دیتی تھی۔ عامۃ المسلمین پر حکومت کی منادی اور حکم مقاطعہ کا کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ اور ابوذر رضی اللہ عنہ تھے کہ حکمِ زباں بندی میں بھی بدستور جادۂ حق پر گامزن تھے۔

صحاح میں ہے کہ آپ اکثر فرمایا کرتے۔

"ابوذر کی رگ گلو پر تلوار کی دھار بھی رکھ دی جائے تو وہ حق کی بات کرنے سے باز نہیں آئے گا۔ اگر سچی بات کی تبلیغ اس سے رہ گئی ہو تو اسے نافذ کر کے رہے گا۔"

آپ یہ بھی عموماً بیان کرتے تھے :

"میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی ہے کہ میں سچ بات کہوں اگرچہ وہ زہر ہلاہل کا گھونٹ ہی ہو۔"

ظاہر ہے کہ تبلیغ واشاعت کا جذبہ جس کے سینہ میں اس طرح ہیجان خیز ہو وہ لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر بیقرار نہ ہو تو کیا ہو۔ حدیث کی کتابوں میں آپ کے مواعظ و تذکیرات کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔ اس باب میں تمام صحابہ سے الگ تھلگ آپ ایک خاص ذوق وشوق کے مالک تھے۔ حج کے موسم میں خصوصیت کے ساتھ آپ کا یہ تبلیغی جذبہ خاص طور پر ابھر جاتا۔ جہاں کچھ لوگ نظر آتے، کھڑے ہو جاتے۔ فرماتے۔

"لوگو! دوڑو ایک مہربان بہی خواہ بھائی کی طرف۔ میں جندب غفاری ہوں۔"

عامۃ المسلمین کی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے وابستگی و فریفتگی کسی طرح کم نہ ہوئی تو مجبور ہو کر حکومت شام نے دربار خلافت میں ایک مراسلہ روانہ کیا جس میں لکھا۔

"ابوذر کی وجہ سے یہاں بڑا فساد برپا ہو رہا ہے۔ بغاوت کا اندیشہ ہے انہیں مدینہ بلا لیا جائے۔"

(طبقات ص ۱۶۶۔ ج ۴)

حکومت شام کے مراسلہ میں فساد اور بغاوت دو چونکا دینے والے شعلے کی طرح بھڑکتے الفاظ تھے۔ جن پر تساہل اور تغافل خطرناک تھا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے نام یہ فرمان جاری ہوا کہ وہ فوراً مدینہ چلے آئیں۔ فرمان خلافت ملتے ہی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو ایک اونٹ پر سوار کرا دیا گیا جس پر ایک سخت پلان دھرا تھا۔ اونٹ کے ساتھ پانچ حبشی غلام کیے جو اسے بھگاتے لئے جا رہے تھے اور ایک منٹ کے لیے آرام نہ لینے دیتے تھے حتٰی کہ آپ کی رانوں کی کھال ادھڑ گئی، چربی نکل آئی۔ یہ سفر آپ کے لیے بڑا ہی اذیتناک اور روح فرسا تھا۔

(طبقات۔ حضرت ابوذر غفاری۔ عبدالحمید جودۃ السحار۔ ابن خلدون۔ ابن خلکان)

آپ ایکدن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینے کی گلیوں میں جا رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ابوذر! تو ایک نیک آدمی ہے۔ تجھے میرے بعد بڑے مصائب کا سامنا کرنا ہوگا۔"

"کیا راہِ خدا میں؟" حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

"ہاں۔"

"مرحبا! حکم الٰہی جو کچھ ہو۔" حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ مطمئن تھے۔ راہِ حق میں دُنیا بھر کے شدائد و مصائب دامن میں سمیٹنے کو تیار تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کتاب اللہ کی ایک ایک آیت ہزاروں انقلابوں کی حامل ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ کئی ذہنی انقلاب تھے۔ کئی سیاسی، کئی سماجی، کئی معاشی، کئی اقتصادی الغرض اسلام ایک مجسم انقلاب ہے۔

سفرِ شام و دمشق

مدینہ منورہ کے قریب ایک پہاڑ ہے جسے سلع کہتے ہیں۔ سردر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو یہ وصیت کی تھی۔

اذا بلغ البناء سلعا فارتحل الی الشام

"جب مدینہ کی آبادی جبلِ سلع تک پہنچ جائے تو تم شام کی طرف کوچ کر جانا۔"

یہ فرمان کیوں دیا گیا تھا اس کی صحیح علت معلوم نہیں ہو سکی۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فتوحات کے بعد جب مختلف مقبوضات میں فوجی چھاؤنیاں قائم ہوئیں تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے شام کے مکتبہ یعنی فوجی چھاؤنی میں اپنا نام لکھوایا۔

انساب الاشراف بلاذری میں بھی لکھا ہے کہ ان کی اصل چھاؤنی تو شام میں تھی، لیکن حج کے لیے حجاز بھی آتے۔ بہرحال یہ قطعی ہے کہ خلافت عثمانی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ دمشق میں تھے۔ وہاں کمبلوں کا ایک معمولی سا جھونپڑا ڈال لیا تھا جس میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔ (طبقات ابن سعد)

اسی زمانہ میں ابن سبا، جو ابن السودا کے نام سے مشہور تھا مدینہ سے شام آیا۔ یہ یہودی تھا۔ پھر مسلمان ہو گیا لیکن منافق تھا۔ مسلمان بن کر اسلام دشمن تھا پس پردہ مسلمانوں میں انتشار و خلفشار پیدا کرنے کی سازشیں سوچا کرتا تھا۔ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ملا اور انہیں امیرِ شام کے خلاف بھڑکانا چاہا لیکن آپ نے اسے منہ ہی نہ لگایا اور اپنی دعوت و درس کو جاری رکھا۔ نہ صرف مسجد بلکہ بازاروں اور گلیوں میں لوگ ان کا وعظ سننے کے لیے جمع ہو جاتے۔ ایک دن آپ شام کے ایک بارونق بازار میں ہزاروں انسانوں کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"اے لوگو! تم نے حریر کے پردے اور دیبا کے تکیے بنا لیے ہیں۔ آزری صوف پر لیٹنا گوارا نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو چٹائی پر سوتے تھے۔ تم

طرح طرح کے کھانے کھاتے ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو جَو کی روٹی
سے بھی پیٹ نہ بھرتے تھے۔"
وعظ سننے والوں میں جندب بن مسلمہ الفری بھی کھڑا تھا۔ یہ بڑا سازشی آدمی تھا۔ بولا!
"یہ تو بڑا بھاری فتنہ ہے۔"
پھر وہ امیرِ شام کے دربار میں گیا اور کہا۔
"ابوذر رضی اللہ عنہ شامی نظام کو برباد کر دے گا۔ اگر آپ کو شامیوں کی ضرورت
ہے تو اس کا تدارک کر لیجئے۔"
امیرِ شام نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ آئے۔ اس وقت امیرِ شام کے
پاس ابو درداء، شداد بن اوس اور عبادہ بن صامت بیٹھے تھے۔ آپ بھی ان کے پاس جا
بیٹھے۔ دورانِ گفتگو امیرِ شام کی زبان سے بیت المال کے خزانے کے متعلق تعبیر نکل گئی
کہ یہ تو خُدا کا مال ہے۔
ابوذر رضی اللہ عنہ بولے:
"خُدا کا مال نہیں اسے مسلمانوں کا مال کہو۔ مسلمانوں کے مال کو خُدا کا مال
کیوں کہتے ہو۔"
امیرِ شام نے کہا:
"خدا تم پر رحم کرے بھائی۔ کیا ہم لوگ اللہ کے بندے نہیں ہیں اور مال
جس کے پاس بھی جو کچھ ہے وہ اللہ کا مال نہیں ہے تو کس کا ہے؟"
اس کے جواب میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
"ایسا نہ کہو بلکہ مسلمانوں کا مال ہی اس کو کہو کیونکہ بیت المال مسلمانوں کا ہے۔
اس میں شک نہیں کہ ہر چیز کا مالک خُدا ہے۔ کسی کو اس کو اپنے لیے یا
اپنے خاندان کے لیے ذخیرہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اور نہ اسے خدا کا مال
کہتے ہوئے اپنے مفاد پر صرف کیا جا سکتا ہے۔"
"یہ کہنا درست نہیں کہ مال اپنے مفاد کے لیے جمع کیا جا رہا ہے جب کہ
حقیقت تو یہ ہے کہ مصالح عامہ کے لیے مال جمع کیا جاتا ہے۔ اس میں

بخل نہیں کیا جاتا۔ کوئی ایسا معاملہ نہیں جس میں خرچ کرنا ضروری ہو اور اس ضرورت کے تحت خرچ نہ کیا گیا ہو۔"

"اللہ کے لیے نہیں بلکہ اپنی نیک نامی اور ناموری کے لیے لوگوں کے دل اور ضمیر خریدنے کے لیے، لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے۔ مال دے کر لوگوں پر حکومت کرنے کے لیے یہاں عطیات دیئے جاتے ہیں۔ ہر بخشش و عطا کی آڑ میں کوئی مطلب کوئی مقصد چھپا ہے اور یوں امیروں کو اور امیر اور غریبوں کو اور زیادہ غریب بنایا جا رہا ہے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے جسے دُور کرنے کے لیے میں آج سے اس مال کو مال المسلین کہا کروں گا۔"

یہ بڑی مختصر سی ملاقات تھی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اُٹھے اور اپنی راہ لی۔ رسمی الوداعی جملوں کے ساتھ وہاں سے چلے آئے۔ اسی اثنا میں امیرِ شام نے تین سو دینار کی تھیلی ایک غلام کو دیتے ہو کہا۔

"جاؤ اسے ابوذر رضی اللہ عنہ کو دے آؤ۔"

ملازم پیچھے پیچھے گیا۔ راہ میں ابوذر رضی اللہ عنہ کو جالیا اور بولا۔

"امیر نے آپ کی خدمت میں تھیلی بھیجی ہے۔"

آپ نے تھیلی دیکھی اور کہا۔

"اگر یہ روپیہ وہ ہے جو میرے اس سال کے عطیہ کا تھا تو میں اسے قبول کرتا ہوں اور اگر صلہ ہے تو میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔"

غلام تھیلی لیے کھڑا رہا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ بولے۔

"اسی کے پاس لے جا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

ابوذر رضی اللہ عنہ مسجد میں پہنچے تو لوگ ارد گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"اے سرمایہ دارو! جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔ دنیوی

زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔ اپنے مالوں میں غریبوں اور نادار دل کا حق رکھو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تمہیں بہتات کے شوق نے غافل کر رکھا ہے۔ ابن آدم کہتا ہے مال میرا مال۔ مگر تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے کھا لیا اور فنا کر دیا یا تو نے پہن لیا اور پرانا کر دیا اور صدقہ کر دیا جمع کر دیا۔

اے دھن والو! اللہ نے خزانے جمع کرنے سے باز کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ہلاکت ہو سونے کے لیے۔ ہلاکت ہو چاندی کے لیے۔"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے صحابہ ملول ہو گئے جیسے تم ملول ہو گئے تو انہوں نے سوال کیا۔ پھر ہم کون سا مال حاصل کریں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں دریافت کئے دیتا ہوں۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور عرض کی۔ آپ کے صحابہ کو یہ بات بڑی گراں گزری ہے۔ پھر وہ کونسا مال حاصل کریں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ذکر کرنے والی زبان، شاکر دل اور نیک بیوی جو تمہیں تمہارے دین پر مدد دے۔

مال غنیمت مسلمانوں کا حق ہے مگر امیر شام اسے جمع کرتا ہے تاکہ اپنے خادموں اور نگہبانوں پر خرچ کرے۔ اپنے جاہ و جلال پر صرف کرے۔ وہ یہ بھول گیا کہ اسے اللہ کے مال سے صرف دو حلّے لینے جائز ہیں۔ ایک حلّہ جاڑوں کے لیے اور ایک حلّہ موسم گرما کے لیے۔ حج اور عمرہ کا خرچ، اپنا اور اپنے گھر کا رزق وہ بھی اتنا جتنا کہ ایک قریشی لے سکتا ہے۔ جو نہ زیادہ امیر ہو نہ غریب۔ یہ وہ دستور ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا امیر شام آپ کی اتباع کیوں نہیں کرتا؟ مال غنیمت تمام مسلمانوں پر مساوی تقسیم ہونا چاہیئے مگر اب جاگیریں اور گھر بنائے جا رہے ہیں اور ان کی زینت پر ہزاروں دینار خرچ کئے جا رہے ہیں۔ امیر شام بنو امیہ کو ہزاروں دینار دیتا ہے پھر بھی تھوڑا سمجھتا ہے۔
اس پر ایک شخص نے آپ کے کان میں کہہ دیا۔

"معاویہ کو کیا کہہ رہے ہو، ڈرو۔"

ابوذر رضی اللہ عنہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا:

"میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نصیحت کی تھی کہ میں سچی بات کہوں اگرچہ کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔ اور راہ خدا میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کروں۔ میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ میں تجھ سے بزدلی سے پناہ مانگتا ہوں۔ بخل سے پناہ مانگتا ہوں۔ لمبی عمر سے پناہ مانگتا ہوں۔ دنیا اور عذاب قبر کے فتنے سے پناہ چاہتا ہوں۔"

[حضرت ابوذر غفاری۔ عبدالحمید جودۃ السحار ص۱۲۱
مترجم عبدالصمد صارم الازہری]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اپنی دعوت و تبلیغ میں مصروف رہے۔ سرمایہ داروں پر اور زیادہ سختی سے تنقید کرنے لگے۔

ایک مرتبہ امیر شام نے آپ کو اپنا خاص حاجب بھیج کر بلوایا۔ کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ امیرِ شام اصرار کر کے آپ کو بھی دستر خوان پر لے آیا۔ جس پر طرح طرح کے لذیذ کھانے چنے ہوئے تھے۔ امیرِ شام نے کہا۔

"تناول فرمائیے۔"

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا اور فرمایا۔

"میں تو ہر ہفتہ دو سیر گیہوں کھاتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے میرا یہی دستور ہے۔ بخدا اس سے زیادہ نہیں کروں گا جب تک ان سے نہ جا ملوں۔ مگر تم نے تو رنگ ہی بدل دیا ہے۔ رنگ رنگ کے کھانے کھاتے ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی دو کھانوں سے پیٹ نہ بھرا۔ جب کھجوریں کھاتے تو روٹی نہ کھاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ایک چاند سے دوسرا چاند آ جاتا اور آپ کے گھر میں آگ نہ جلتی تھی۔ نہ روٹی نہ کھانا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہمیشہ پیوند لگے کپڑے پہنے اور تم صبح و شام نیا زرق برق لباس پہنتے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تم ایسے نہ تھے۔"

"وہ زمانہ ختم ہو گیا۔ اب ہم عجمیوں کے شہروں میں اگر ایسا نہ کریں تو وہ ہمیں

حقیر سمجھیں گے۔ آپ بھی اچھا لباس پہنیں۔ ابھی حاضر کیے دیتے ہیں۔"

اس کے جواب میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"میں تو اپنی ہیئت تبدیل نہیں کر سکتا۔ شاید قیامت کے دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ نسبت تمہارے زیادہ قریب ہوں۔ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کہ قیامت کے دن مجھ سے زیادہ قریب تم میں سے وہ شخص ہوگا جو دُنیا سے اس ہیئت پر نکلے گا جس پر میں نے اسے چھوڑا ہے۔"

"امیر لوگ شکایت کرتے ہیں کہ آپ غریبوں کو ان کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔"

"میں انہیں ذخیرہ اندوزی سے روکتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے انہیں عذاب الیم کی خوشخبری سنا دو۔ خدا کی قسم میں لوگوں کو زُہد کی طرف بلاتا رہوں گا۔ مال جمع کرنے سے ڈراتا رہوں گا اور ذخیرہ اندوزوں کو عذابِ جہنم کی خوشخبری دیتا رہوں گا۔"

امیرِ شام نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اپنی راہ لی۔ راستے میں ایک شامی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا۔

ابوذر! تم نے امیرِ شام کو ناراض کر دیا ہے۔"

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

"امیرِ شام کو ناراض کرنا اللہ کو ناراض کرنے سے بہتر ہے۔"

(طبری کامل)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی دعوت و تبلیغ بدستور جاری رہی۔ اپنی تقاریر اور عمل کے ذریعے اسلام کے اصلی خدوخال کو اُجاگر کرتے رہے۔ عوام الناس کو حقیقی اسلام کے افکار و نظریات کی تلقین کرتے رہے۔ مسلم عوام بس اتنا ہی جانتے تھے کہ نماز پڑھنا، روزہ رکھنا اور حج کرنا مسلمان

ہونے کے لیے کافی ہے اور اس سے زیادہ نہ ان کی ذمہ داری ہے اور نہ اُن فرائض میں شامل ہے۔ حالانکہ اسلام ایک مکمل دین ہے۔ جو عالم بشریت کی نجات کے لیے آیا ہے اور یہ نجات اور فوز و فلاح اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک ایک نظامِ الٰہی اور ایک حکومتِ الٰہیہ قائم نہ ہو جائے۔

اسی بنا پر اسلام وہ دین ہے جو بنی نوع انسان کی زندگی کے ابعاد ثلاثہ پر محیط و بسیط ہے۔ اور نوع انسانی کو انفرادی و اجتماعی حیثیت سے ذمہ دار اور جواب دہ قرار دیتا ہے۔

اسلام دینِ مسئولیت ہے۔ وہ فرائض و حقوق مقرر کرتا ہے اور ہر مسلمان ادائیگی فرائض و حقوق کا پابند ہے۔ جو اپنے عقیدہ کا مطیع و فرمانبردار ہے اور جو انسانی معاشرہ میں اقدار الٰہی کی ترویج و اقدام کے لیے جہاد و مبارزہ سے دریغ نہیں کرتا۔ اور حصولِ مقاصد تک اپنی مساعی جمیلہ کو جاری رکھتا ہے۔

مسلم فرد وہی ہے جو مقاصد الٰہی کے حصول میں ہر قسم کی سختیوں کو برداشت کرے اور اس راہ میں جان و مال قربان کرنے میں ذرا دریغ نہ کرے۔ اور راہِ خدا میں جانفشانی اور قربانی جان سے حاضر رہے ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

دراصل مومن وہی ہے جو باطل کی دُھول اور گرد و غبار سے حقیقی اسلام کے چہرہ کو دھندلانے نہ دے۔ جو اقدار الٰہیہ کی حفاظت و پاسداری میں اپنی جان کا نذرانہ بارگاہِ الٰہی میں پیش کرے۔ اور بہ طیب خاطر شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو تاکہ اسلام پر کسی قسم کی چیش نہ آئے اور ہر خطرہ سے محفوظ رہے۔

اسلام ظالموں اور ستمگروں سے جہاد و مبارزہ اور دُنیا بھر کے محرومین و مستضعفین کی حمایت و دفاع کا نام ہے۔ دین اسلام کی غرض و غایت اور اس کا مطلوب و مقصود ایک ایسے نظام کا قیام ہے کہ جس میں اقدار الٰہی کے مطابق عدالتِ اجتماعی، فضائل انسانی

اور رشد و کمال کی بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ اور لوگ اس حکومت کے سائے میں اپنے وجود کے ابعاد کی ترقی و بالیدگی کی طرف متوجہ ہوں اور انسانی کمالات کے درجاتِ عالیہ پر سرفراز ہوں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تسلسلِ جہاد کے ساتھ بذریعہ مواعظ حسنہ مذکرہ بالا حقائق کو عوام کے سامنے پیش کرتے رہے اور حقیقی اسلام کی تعلیم دیتے رہے۔ اس کارِ عظیم کا تذکرہ جو انہوں نے اپنے خونِ دل سے سینچ کر انجام دیا دائرہ تحریر سے باہر ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے فکری و عملی جہاد نے شام و دمشق میں ہلچل مچادی آپ کی مجاہدانہ آواز کی گھن گرج سے قصرِ امارت لرزنے لگے۔ فلاکت زدہ بھوکے ننگے لوگوں کی جنبش و حرکت نے دمشق و شام کے گوشے گوشے میں گلوگیری و ناراضگی اور اضطراب و بے چینی کی لہر دوڑا دی۔ جملہ پابندیوں اور رکاوٹوں کے باوجود سرمایہ داری کے خلاف فاقہ کشوں کے قیام و اجتماع کو روکا نہ جاسکا۔ یہ در اصل سکوت و خاموشی میں ایک آواز اور ظلم وستم کی تاریکی میں ایک روشنی تھا جس سے ظاہر تھا انقلابی کسی طرح بھی اپنے بلند و بالا مقاصد کے حصول سے باز نہیں آئیں گے۔

حکومت شام نے اسے اپنے استحکام و اقتدار کے لیے ایک زبردست خطرہ تصور کرتے ہوئے دربار خلافت کو ایک تشویشناک مراسلہ ارسال کیا۔ اور شام و دمشق میں رونما ہونے والے حالات و واقعات سے آگاہ کرتے ہوئے اس کے فوری سدباب کی درخواست کی تو اس کے جواب میں امیر المومنین کا جو مراسلہ حکومتِ شام کو موصول ہوا اس میں یہ تاکیدی حکم تھا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو فوراً مدینہ منورہ روانہ کر دیا جائے۔

امیر المومنین کے تاکیدی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ایک اونٹ پر سوار کرا دیا گیا۔ جس پر ایک سخت پالان دھرا تھا اور اس کے ساتھ پانچ حبشی غلام کیے جن کو یہ حکم تھا کہ وہ اونٹ کو بھگاتے لے جائیں۔ اسے ذرا بھی کہیں رکنے نہ دیں۔ ذرا آرام نہ لینے دیں۔ اس سواری سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو سخت تکلیف و اذیت پہنچی۔ یہاں تک کہ منزل تک پہنچتے پہنچتے آپ کی رانوں کی کھال اُدھڑ گئی اور چربی نکل آئی۔

(طبری کامل۔ طبقات۔ زاد المعاد)

مدینہ میں ورودِ مسعود

خود حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہی کا بیان تھا کہ جس وقت میں مدینہ میں داخل ہوا خلق خدا تھی کہ ٹوٹی پڑتی تھی۔ چاروں طرف سے لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس سے پہلے انہوں نے مجھے کبھی نہیں دیکھا۔

زائرین و مشتاقانِ جمالِ ابوذری رضی اللہ عنہ کا یہ ہجوم ایک دو دن تک محدود نہ رہا بلکہ روزانہ اور ہر وقت لوگوں کی بھیڑ آپ کے گرد رہتی تھی۔ آپ نے حسبِ معمول یہاں بھی وعظ و پند جاری رکھا۔ منجملہ اور باتوں کے آپ اس ضمن میں مسئلہ کنز بھی بیان کرتے تھے۔

یہ ایک ایسا دلخراش مسئلہ تھا کہ یہاں بھی سرمایہ داروں کی تیوریاں چڑھنے لگیں۔ آہستہ آہستہ یہاں بھی اس مسئلہ نے زور پکڑا۔ مسند احمد میں صاف طور سے مذکور ہے کہ دربارِ خلافت میں آپ کی شکایتیں پہنچنے لگیں۔

طبقات ص ۱۶۶ ج ۴ اور البلاذری نے انساب الاشراف میں لکھا ہے کہ گفتگو کی ابتدا ایک خاص مسئلہ سے خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی۔ آپ نے حاضرینِ مجلس کو خطاب کر کے یہ مسئلہ پوچھا کہ کیا مسلمانوں کے امیر اور امام کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ بطور قرض بیت المال سے رقم لے اور حسبِ سہولت ادا کرے؟

اس پر ایک مفتی کعب احبار نے فتویٰ دیا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اُس نے کہا:

آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام مذہبوں میں سب سے زیادہ آسان اور معتدل

شریعت اسلام کی ہے۔ اسلام کا ہر قانون انسانی قوتوں کے موافق اور ان کی فطرتوں کے مطابق ہے ـــــ اور یہ بھی کہ موسوی شریعت تمام شریعتوں میں سخت گیر ہے، کڑی ہے۔ پھر جبکہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی مال جمع کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ اور کہ جب یہودیوں کو بھی اس کا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی ساری دولت خدا کی راہ میں لٹا دیں تو اسلام کی معتدل ومتوسط شریعت میں یہ سخت قانون کس طرح ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ضرورت سے زیادہ بچ جائے اسے خدا کی راہ میں لٹا دیا جائے ورنہ قیامت کے دن وہ انگارے بن کر لپٹیں گے۔"

رُوح المعانی صـ۳۱ ج ۴ میں ایک اور روایت منقول ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کعب احبار نے کہا۔

"جب ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنی ساری دولت خدا کی راہ میں لُٹا کر مرے اور اپنے پاس کچھ اندوختہ نہ چھوڑے تو پھر اللہ تعالیٰ نے میراث کی آیتیں کیوں نازل کیں۔ جب میت کے لیے کچھ چھوڑ کر مرنا ہی جائز نہیں ہے تو وارثوں پر کیا چیز تقسیم ہوگی۔ الغرض قرآن کی اقتضاء النص سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کل مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ضروری نہیں ہے۔"

اس کے جواب میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"ابے یہودن کے بیٹے! تو کون ہے جو یہاں اور اس مقام پر آکر بول رہا ہے کیا ہم لوگوں کو تو ایمان سکھاتا ہے۔ یہودی بچے سُن! ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد پہاڑ کی طرف سے گزر رہے تھے۔ میں آپ کے ساتھ تھا فرمایا۔ اے ابوذر! میں نے کہا۔ لبیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ نے فرمایا۔ قیامت کے دن اہلِ ثروت مفلس ہوں گے۔ پھر فرمایا۔ ابوذر! میں نے کہا۔ ارشاد یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ میری جان اور مال آپ پر قربان۔ فرمایا۔ اگر میرے پاس اُحد کے برابر سونا ہوتا اور میں اسے راہِ خُدا میں خرچ کر

دیتا تو مرتے دم مجھے دو تولہ بھی چھوڑنا گوارا نہ ہوتا۔ پھر فرمایا۔ ابوذر! تو زیادہ چاہتا ہے اور میں کم چاہتا ہوں۔ یہ دن کے بچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسا فرما گئے اور تو کہتا ہے اگر کوئی پیچھے چھوڑ گیا تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

حضرت ابوذر غفاری پر جذب غالب تھا۔ جلال میں آ گئے۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی محجن سے کعب پر حملہ کر دیا۔ طبری میں لکھا ہے کہ محجن ایک قسم کی لاٹھی تھی۔ جس کی نوک پر آخر میں آنکس کی مانند کوئی چیز لگی ہوتی تھی۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے محجن مار کر کعب احبار کا سر پھوڑ دیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے جلالی طرزِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے اس زخم کو مانگ لیا یعنی اپنی خاطر سے معاف کرا دیا۔

کعب احبار صحابی بھی نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایمان لایا تھا اور اس نے اعتراض بھی کیا تو اس شخص پر جس پر عام صحابیوں کو بھی نکتہ چینی کرنے اور اعتراض کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

[ابن خلدون - کامل ابن اثیر
تفسیر رُوح المعانی۔ انساب الاشراف
البلاذری]

اس واقعہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ میں جو باتیں ہوئیں کامل میں ابنِ اثیر نے اس گفت گو کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"ابوذر رضی اللہ عنہ! شام کے لوگ تم سے شاکی ہیں۔" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"لوگ نہیں امیرِ شام کہیئے۔" حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بطور فہمائش کے کہا۔

"ابوذر! ہم پر جو کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جو باتیں ہم پر واجب ہیں انہیں ادا کریں اور رعیت کو بھی کد و کاوش اور اعمال میں اعتدال اور اقتصاد کی دعوت دیں۔ لیکن ہم پر یہ تو واجب نہیں ہے کہ لوگوں کو ترک دُنیا اور زہد پر مجبور کریں۔"

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

"سرمایہ دار جب تک اپنی دولت نیک کاموں پر صرف نہ کریں۔ ان سے ہرگز راضی نہ ہونا چاہیئے۔ جب تک وہ پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش نہ آئیں۔ بھائیوں کی خبر گیری نہ کریں اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی نہ کریں۔ میں ترک دنیا پر کب لوگوں کو مجبور کرتا ہوں بلکہ امراء سے غرباء کے حقوق مانگتا ہوں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے اگر میری گردن پر تلوار رکھ دی جائے اور مجھے یہ گمان ہو کہ گردن کٹ جانے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حکم بھی تمہیں سنا سکوں گا تو ضرور سناؤں گا۔"

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے پھر اپنی تبلیغ زوروں سے شروع کر دی۔ سرمایہ داری کے خلاف بولتے رہے۔ فقیروں کی غمخواری کی تبلیغ کرتے رہے تو مروان ابن الحکم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کان بھرے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کی طرف سے خلیفہ کے دل میں بدگمانی پیدا کر دی۔ آپ ابوذر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو گئے۔ اسی دوران میں ایک سخت حادثہ پیش آیا۔ اسی زمانہ میں عبداللہ ابن سبا یہودی مفسد الامت مدینہ میں وارد ہوا اور بغاوت و سازش کی اندرونی تحریکوں میں مصروف ہو گیا۔ بلکہ ابن خلدون سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابوذر شام ہی میں تھے اسی وقت سے عبداللہ بن سبا مختلف شہروں کی سیر کرتے ہوئے مختلف صحابہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تفصیلی طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس فتنے کا گو علم اس وقت نہ ہوا لیکن اجمالی طور پر آپ کو اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ان کی طرف سے بددل و بدگمان ہو رہی ہے۔

عبداللہ بن سبا یمن کا ایک یہودی تھا بالاتفاق مورخین اسلام نے لکھا ہے کہ منافقانہ طور پر عہد عثمانی میں مسلمان ہو جانے کا دعوی کر کے اسلامی ممالک میں اپنی ایک خفیہ جماعت کے ساتھ سازش کا ایک جال بچھایا۔

(لسان المیزان ص ۲۸۹ ج ۳)

ترمذی اور حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن سبا، دشمن اسلام یہودی تھا۔ بظاہر اسلام اختیار کر کے مسلمانوں کے شہروں میں گھومتا پھرتا تھا تاکہ مسلمانوں کو اپنے امراء کی اطاعت سے برگشتہ اور باہم مسلمانوں میں شر و فساد پھیلائے۔

البلاذری نے لکھا ہے کہ شام میں بھی فتنہ پردازوں کا یہ گروہ حکومت کے خلاف محاذ کھڑا کرنے کے لیے آیا تھا لیکن آپ نے نہایت نفرت و سختی سے اس گروہ کے خلاف تنفر و لاتعلقی کا اظہار کیا۔ اب وہی گروہ مدینہ منورہ میں باغیانہ سازشیں کر رہا تھا اور عوام کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ابھار رہا تھا۔ اور اپنی تخریبی سرگرمیوں میں اس قدر محتاط و ہوشیار تھا کہ کوئی اس کی نشاندہی نہ کر سکتا تھا۔

دامن پر کوئی چھینٹ نہ ہاتھوں پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کان میں ان خفیہ چہ میگوئیوں کی بھنک پڑی تو فطرتاً آپ اس کا پتہ لگانے لگے کہ کون کون لوگ اس فتنہ میں شریک ہو رہے ہیں ابن خلدون کے حوالے سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مفسدوں کی جماعت شام میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تھی اور آمادۂ بغاوت کرنا چاہا تھا ممکن ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ہو گئی ہو۔

البلاذری نے بھی لکھا ہے کہ شام ہی میں فتنہ پردازوں کا یہ گروہ حکومت کے خلاف حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو کھڑا کرنے آیا تھا۔

ادھر مناظرہ کا ایک ناگوار واقعہ اور پھر شام سے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو یکایک مدینہ بلا لینا یہ چند باتیں ایسی پیش آگئیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوذر غفاری سے بھی کچھ بدگمانی ہو گئی۔ جس کی خبر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو بھی مل گئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کی طرف سے بدگمان ہو رہے ہیں۔

یہ سنتے ہی آپ کو جلال آگیا۔ آپ اسی وقت اُٹھے اور اپنے قبیلہ کے چند افراد کو ساتھ لے کر سیدھے آستانۂ خلافت کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ خبر سننے سے آپ پر ایک ایسی کیفیت

طاری ہوگئی تھی کہ گویا مدہوش ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ جس دروازے سے مکان خلافت میں جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی آپ دُرّہ لیے ہوئے اسی دروازے میں گھس گئے۔

(ابنِ خلدون۔ البلاذری)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب آپ کو اس طرح آتے دیکھا تو یکایک آپ ٹھٹک کر رہ گئے۔ آپ پر جلالت ابوذری کا خوف طاری ہو گیا۔

(طبقات ابنِ سعد ۱۲)

جو خطرہ ظن و گمان کی حد تک محدود تھا اس نے یقین کی صورت اختیار کر لی مشکوکات یقینات میں بدل گئے۔ لیکن آپ جس حالت میں بیٹھے تھے اسی حالت میں بیٹھے رہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ قریب پہنچ گئے۔ فرمایا!

"السلام علیکم"

اور اس سے قبل کہ کچھ مزاج پُرسی کریں۔ گھبرائی ہوئی آواز میں آپ نے کہا۔

اَحَسِبْتَنِیْ مِنْھُمْ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

"کیا آپ بھی مجھے ان لوگوں میں (مفسدوں میں) گمان کرتے ہیں اے مسلمانوں کے امیر!"

اور اس کے بعد اُس زبان نے جس سے زیادہ سچی بات آسمانوں اور زمین کے درمیان اور کسی نے نہ کہی، اس طرح فتنہ و فساد سے اپنی لاتعلقی ظاہر کی۔

"قسم خدا کی! نہ میں ان لوگوں میں ہوں اور نہ میں ان کو جانتا ہوں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ ان کی علامت تو گھٹے ہوئے سر ہیں۔ وہ دین سے اس طرح دُور ہوں گے جس طرح شکار کو تیر توڑ کر نکالا جاتا ہے۔"

(ماخوذ طبقات و فتح الباری)

چونکہ تفصیلی طور پر آپ کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ صرف شام میں ایک دفعہ کچھ لوگ آپ کے پاس آئے تھے اور وہ بھی خدا جانے صحیح ہے یا نہیں بہرحال آپ کا علم اس فتنہ کے متعلق صرف اسی قدر تھا جس قدر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہ کچھ لوگ آمادہ فساد ہیں۔

اور اس علم کو علم نہیں کہہ سکتے۔ (ماخوذ طبقات و فتح الباری)

فتنہ و فساد سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی لاتعلقی اور برأت کے لیے یہ الفاظ خصوصاً جب وہ قسم کے ساتھ ہوں بہت کافی تھے۔ آپ نے مزید ارشاد فرمایا۔

"مسلمانوں کے امیر کی تسلی و تشفی کرنے کے لیے اگر مجھے حکم دیا جائے کہ پالانوں کی لکڑیوں میں لٹک جاؤں تو اسی وقت لٹک جاؤں گا جب تک کہ مجھے چھوڑنے کا حکم نہ دیا جائے۔ اسی طرح اگر مجھے حکم دیا جائے کہ کھڑا ہو جا تو میں کبھی نہیں بیٹھوں گا جب تک کہ مجھے بیٹھنے کا حکم نہ دیا جائے۔"

(فتح الباری)

مورخین کے بیان کے مطابق اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اٹھے اور ہاتھ پکڑ کر ابوذر رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

ولنعم ما قیل

طبقات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد دیر تک دونوں میں کچھ سرگوشیاں ہوتی رہیں حتیٰ کہ کبھی کبھی آواز بلند بھی ہو جاتی۔ یہ تمام واقعات طبقات ابنِ سعد میں ملتے ہیں۔

طبقات ہی سے اس قدر اور بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ قصرِ خلافت سے نکلے تو مسکراتے ہوئے نکلے۔ لوگوں نے پوچھا بھی کہ امیر المومنین اور آپ میں کیا باتیں ہوئیں۔ لیکن آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف اتنا فرماتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

"سننے والا فرمانبردار ہوں۔ اگر مجھے حکم دیا جائے گا کہ تم عدن یا صنعا چلے جاؤ اور مجھ میں طاقت چلنے کی باقی رہے گی تو میں اسی وقت چلا جاؤں گا۔" (مسند احمد ۲۔ طبقات ابن سعد)

اس کے بعد آپ نے مدینہ منورہ کو بھی چھوڑ دیا لیکن کیوں چھوڑا؟ عام مورخین تو لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کو جلا وطن کر دیا تھا۔ دیس نکالا —!

اس باب میں سب سے زیادہ موثق و مستند کتاب طبقات ابنِ سعد ہے۔ علاوہ بہت سی خصوصیتوں کے سب سے بڑی خصوصیت اس میں یہ ہے کہ طبقات صحابہ میں سب سے پہلی اور قدیم کتاب ہے۔ بعد والوں نے جو کچھ لکھا ہے اسی کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ عموماً اسی کے رہینِ منت ہیں۔ اس واقعہ سے متعلق ابنِ سعد نے جو لکھا اور جیسا کہ امام بخاری کا بھی بیان ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ پر مدینہ منورہ میں لوگوں کا ہجوم بہت زیادہ ہونے لگا جس کا تذکرہ آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک پہنچا تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے خواہش ظاہر کی کہ میں مدینہ سے چلا جاتا ہوں۔

مدینہ اس زمانہ میں دار الخلافۃ الکبریٰ تھا۔ لاکھوں آدمیوں کا اجتماع رہتا تھا جس وقت ابوذر رضی اللہ عنہ نکلتے لوگ خواہ مخواہ پیچھے پڑ جاتے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ مدینہ کی آبادی شام تک پھیل گئی ہے اس حالت میں مجھے یہاں رہنے کا حکم نہیں۔ اس واقعہ کی ابن جریر طبری میں آخری وجہ یہ مذکور ہے کہ مدینہ کے جلیل تابعی حضرت سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا اخراج عمل میں نہیں آیا۔ انہوں نے فرمایا۔

اذا اخرج ابوذر الیھا راغبانی سکنھا

یعنی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ربذہ میں رہنے کی خود خواہش ظاہر کی۔ اس کے جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہی کہا تھا۔

ان شئت تحیت فکنت قریبًا

"اگر تم یہی چاہتے ہو تو پھر (مدینہ) کے کسی ناحیہ میں چلے جاؤ تاکہ قریب رہو۔"

اس پر آپ نے فرمایا۔

اندب لی ان اخرج الی الربذہ۔

"مجھے اجازت دی جائے تاکہ میں ربذہ چلا جاؤں۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"اچھا آپ وہاں جا سکتے ہیں۔ میں بیت المال سے کچھ اونٹنیوں کو دودھ

کے لیے آپ کے پاس بھیج دوں گا۔"
لیکن ابوذر رضی اللہ عنہ کی غنی طبیعت نے اس کو قبول نہیں کیا بلکہ قریش کے نوجوان جو وہاں بیٹھے تھے ان کو مخاطب کر کے آپ نے فرمایا۔

"دونکم معاشر قریش دنیاکم فاغنموها لاحاجة لنا فیها۔"

"قریشیو! اپنی دُنیا کو تم لو اور اسے خوب زور سے تھامو۔ ہمیں اس کی کوئی ضرورت وحاجت نہیں۔"

یہ فرما کر آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے رخصت ہوئے۔ آپ کے اہل وعیال آپ کے ساتھ تھے ؎

کون جانے کہاں بچھڑ جائیں
رات تاریک ہے قریب رہو

مسند احمد میں یہ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے کہا۔

یا اباذر ارئیت ان قتل الناس بعضهم بعضاً حتّٰی تفرق حجارة الزیت من الدم کیف تصنع قال اللہ ورسولہٗ اعلم، قال اقعد فی بیتک واغلق علیک بابک قال فان لم اترک قال من انت منهم فکن دفیهم قال فاخذ سلاحی، قال اذاً تشارکهم فیما هم فیه ولکن ان خشیت ان یدهک شعاع السیف فانفطرت ردائک علٰی وجهک حتّٰی بتوا باثمه واثمک۔

"اے ابوذر! تو کیا کرے گا جب آپس ہی میں ایک دُوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیں گے۔ حتیٰ کہ اس قدر خون بہایا جائے گا کہ حجارۃ الزیت (مدینہ کے قریب ایک مقام کا نام ہے) کی زمین خون میں غرقاب ہو جائے گی۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جانتے ہیں کہ مجھے اس وقت کیا کرنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے گھر بیٹھ جانا اور دروازہ بھیڑ لینا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اگر وہ ہمیں نہ چھوڑیں ؟ آپ نے فرمایا تب جن لوگوں سے تم ہو ان کی جماعت میں آکر مل جانا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا تو کیا میں تلوار اٹھاؤں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت تم بھی فساد میں شریک ہو جاؤ گے ایسا نہ کرنا۔ اگر تم کو تلوار کی چمک سے خوف معلوم ہو تو اپنی چادر کے پلّے سے منہ ڈھانپ لینا تاکہ تم پر حملہ کرنے والا تمہارا اور اپنا گناہ لے کر واپس ہو۔"

مذکورہ عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابوذر غفاری مسلمانوں میں فتنہ و فساد نہ چاہتے تھے۔ خونریزی کو پسند نہ کرتے تھے۔ چپکے سے بیابان میں چلے جانے کو ترجیح دی۔

ابوذر رضی اللہ عنہ بیابانِ ربذہ میں

ذات عرق سے جو سڑک مکہ معظمہ کو جاتی تھی ٹھیک اسی کے کنارے مکہ معظمہ سے تین منزل دُور ربذہ ایک ہولناک ویرانہ تھا اور نجد کا ایک حصہ تھا۔

ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی بیت المال کے اونٹ وغیرہ یہاں رہتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ریوڑوں کی حفاظت کے لیے یہاں کبھی کبھی آکر سکونت پذیر ہوتے تھے۔ اور بقول طبری حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے یہاں ایک مسجد کی داغ بیل ڈالی تھی اور علاجاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ربذہ ہی بھیجا تھا کہ اس مقام کی فضا مرض کی شفا کے لیے نافع تھی۔

بہرکیف جس زمانہ میں آپ یہاں تشریف لائے وہاں کے نظم و نسق کا مہتمم ایک حبشی غلام تھا جس کا نام مجاشع تھا۔ ربذہ کی آبادی بارہ نفوس پر مشتمل تھی جن میں زیادہ مرد اور کچھ عورتیں تھیں۔

(فتح الباری ج ۳۔ تاریخ ابن اثیر ۱۲۔ طبری کامل۔ ابن خلدون)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا سالانہ وظیفہ دربار خلافت سے چار ہزار درہم تقریباً نو سو روپیہ مقرر تھا۔ الذہبی نے اپنی کتاب دول الاسلام میں لکھا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی سالانہ عطا چار ہزار دینار سے تھے۔ بقول طبری اونٹوں کا ایک "صرمہ" گلہ آپ کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مختص کر دیا تھا اور دو غلام بھی ساتھ کر دیئے تھے۔

طبری میں ہے کہ سرکاری عمال جو ربذہ میں تھے حکومت کی طرف سے روزانہ

ان کے لیے چند اونٹ ذبح ہوتے تھے۔ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو بھی اس سے ایک حصہ ملتا تھا۔

وہاں بھی مکان حسبِ دستور آپ نے اینٹ و مٹی کا نہیں بنایا تھا کمبلوں کا ایک جھونپڑا سا ڈال لیا تھا۔ قریب ہی آپ نے ایک تالاب بنوا لیا تھا جس میں برسات کا پانی جمع ہو کر ذخیرہ ہو جاتا تھا۔ آنے جانے والے مسافر اور ان کی سواری کے جانوروں کا کام بھی اس تالاب کے پانی سے چلتا تھا۔

جب ابوذر رضی اللہ عنہ مدینہ سے سوئے ربذہ چلے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے دونوں فرزند حسن اور حسین علیہما السلام کے ساتھ آپ کو الوداع کہنے آئے۔ لیکن مروان نے روکنا چاہا اور کہا۔

"اے علی رضی اللہ عنہ! امیرالمومنین نے منع کر دیا ہے کہ کوئی شخص ابوذر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ جائے، نہ رخصت کرے۔ اگر آپ کو اس حکم کی اطلاع نہیں ہے تو میں آپ کو مطلع کیے دیتا ہوں۔"

مروان بن الحکم راندۂ دربارِ رسالت تھا۔ منافق تھا۔ کتابت وحی میں تحریف کا مرتکب ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شہر بدر کر دیا تھا۔ بایں ہمہ خلیفہ سوم کا بڑا قریبی رشتہ دار تھا۔ آپ نے صرف اسے قریب کر لیا بلکہ جانے کن مجبوریوں کے باعث اسے خلافت اسلامیہ کا مہر بردار (پرائیوٹ سیکرٹری) بنا دیا تو اس کی منافقت نے یہاں بھی بڑے گل کھلائے۔ اسلام دشمنی سے باز نہ آیا۔ پس پردہ ریاست اور سربراہ ریاست کو شدید نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔ خلافِ دین بدعنوانیاں وہ کرتا تھا لیکن بدنام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہوتے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو الوداع کہنے کے لیے علی رضی اللہ عنہ آئے تو مروان راستے میں حائل ہو گیا۔ آپ نے کوئی توجہ نہ دی اور ابوذر رضی اللہ عنہ کی طرف بڑھے۔ مروان نے تعرض کیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کی اونٹنی کے دونوں کانوں کے درمیان کوڑا رسید کیا اور فرمایا۔

"دُور ہو جا۔ خدا تجھے جہنم رسید کرے۔"

مروان نے اونٹنی کی مہار پھیری اور ابوذر کو چھوڑ کر چلا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا اور شکایت کی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور ان کے ساتھی صحابی رسول کے ساتھ کافی دُور تک گئے رخصت ہونے لگے تو ابوذر رضی اللہ عنہ نے علی کرم اللہ وجہہٗ کو سینے سے لگا لیا اور آنسو بہاتے ہوئے فرمایا۔

"اے ابوالحسن! جب میں آپ کو اور آپ کے دونوں فرزندوں کو دیکھتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاد آتے ہیں۔"

علی کرم اللہ وجہہٗ ابوذر رضی اللہ عنہ کو رخصت کر کے واپس چلے تو لوگ ملے۔ انہوں نے کہا۔

"امیرالمومنین آپ سے ناراض ہیں کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کو رخصت کرنے کیوں گئے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"آپ نے مروان کے ساتھ کیوں ایسا سلوک کیا۔ آپ نے مجھ پر جرأت کی اور میرے قاصد اور میرے حکم کے خلاف کیا۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے جواب دیا۔

"مروان نے مجھے لوٹانا چاہا میں نے اُسے لوٹا دیا۔ رہا آپ کا حکم تو میں نے اس کی تردید نہیں کی۔"

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے ملنے اور رخصت کرنے کے بارے میں حکم امتناعی جاری کیا ہے؟"

"کیا ہر وہ چیز جس کا آپ حکم دیں اور وہ خلاف حکم الٰہی ہو اور حق کے خلاف ہو تو ہم اس کا اتباع کریں۔ خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"قسم بخدا میں مروان کا حق دلا کر چھوڑوں گا۔" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"تو یہ رہی میری اونٹنی۔ اگر وہ انتقام چاہتا ہے تو لے لے"۔
اس وقت وہاں کچھ مہاجر و انصار موجود تھے۔ انہوں نے بدمزگی مزید بڑھنے نہ دی۔
(طبری کامل۔ ابن خلدون۔ فتح الباری)

ربذہ میں آپ کے ساتھ ایک تو آپ کی حرم محترمہ اور دوسری آپ کی صاحبزادی۔
حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے یہاں بچے تو بہت پیدا ہوئے لیکن عموماً کمسنی میں انتقال کر گئے۔
ابونعیم نے حلیہ میں بچوں کی موت کے متعلق حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا ایک عجیب فقرہ نقل کیا ہے۔ کسی نے آپ سے پوچھا۔

"ابوذر رضی اللہ عنہ! آپ کے بچے زندہ کیوں نہیں رہتے؟"

آپ نے فرمایا۔

الحمد للہ الذی یاخذھم فی دار الفناء ویدخلھم فی دار البقاء۔

"شکر ہے اللہ کا جس نے ان بچوں کو فانی گھر سے لے لیا اور باقی رہنے والے گھر کے لیے ان کو ذخیرہ بنا لیا"۔

اولاد کے لیے لوگوں نے آپ کو دوسری بیوی کرنے کا مشورہ دیا لیکن آپ راضی نہ ہوئے۔ آخر عمر میں آپ کا خاندان ان ہی دو عورتوں (بیوی اور بیٹی) اور خود آپ کی ذات سے عبارت تھا۔

ابوذر رضی اللہ عنہ اب ربذہ کے بیابان میں زندگی گزار رہے تھے اور خوش تھے کہ تمام جھنجھٹوں سے نجات ملی۔ ربذہ میں آپ کے پاس جو کچھ تھا اوروں کے نزدیک وہ کافی ہو یا نہ ہو لیکن ان کے غنی دل نے اس کو ہمیشہ کافی خیال کیا۔

شام کے گورنر حبیب بن مسلمہ نے ایک دفعہ آپ کی خدمت میں تین سو اشرفیاں بھیجیں اور لکھ بھیجا۔

استعن بھا علی حاجتک

"اپنی ضرورتوں میں ان سے مدد لیجیے"۔

لیکن حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے قاصد کو جواب میں کہا۔

"ان اشرفیوں کو تم ان ہی کے حوالے کر دینا اور کہنا ان کو مجھ سے زیادہ غریب آدمی نہیں ملتا۔ خدا کے فضل سے میں ایک سائبان رکھتا ہوں جس کے سائے میں آرام کرتا ہوں۔ بکریوں کے ایک گلے کا بھی مالک ہوں جو دن بھر چر کر شام کو میرے گھر آجاتی ہیں اور ان کی وجہ سے دودھ کی ریل پیل ہو جاتی ہے ایک کنیز بھی ہے جو کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اس کے بعد دور از کار مال مجھے درکار نہیں۔"

حبیب مسلمہ صحابی تھے یا تابعی لوگوں کو اس میں اختلاف ہے۔ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر بارہ سال تھی۔ بہر حال انہوں نے امیر شام کی ماتحتی میں رومی علاقوں میں بڑی کامیاب مہیں سر کیں۔ رومیوں کے ساتھ اسی جہاد کے شغف کی وجہ سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ان کو "حبیب الروم" کہا کرتے تھے۔ اور یہی لقب حبیب کا عوام میں مشہور ہو گیا۔ آرمینیا کی مہم میں وفات پائی اور اسی علاقے میں مدفون ہوئے۔ کہتے ہیں ان کا شمار مُستجاب الدعا لوگوں میں تھا جن کی دعا کبھی رد نہیں ہوئی۔

(تہذیب التہذیب)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو اپنی اس باطنی امارت، اندرونی تونگری پر اتنا ناز تھا کہ کبھی کبھی چھلک پڑتے اور فرماتے۔

"بنی اُمیہ کے امرا مجھے فقرا اور فلاکت سے ڈراتے ہیں حالانکہ فقر تونگری سے مجھے زیادہ عزیز ہے۔"

بیابان ربذہ میں مختصر سامان کے ساتھ بھی آپ کا یہ حال تھا کہ آپ عموماً مسافروں کو اپنے پاس ٹھہراتے اور جس طرح بن پڑتا اپنی وسعت کے مطابق خاطر و تواضع میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے۔ ایک جلیل القدر تابعی کا بیان ہے۔

ربذہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے یہاں بہت سے مہمان اُترے ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ آپ خود اُٹھے اور جس قدر بکریاں تھیں ایک ایک

کرکے آپ نے سب کا دُودھ خوب نچوڑ نچوڑ کر نکالا حتیٰ کہ کوئی تھن باقی نہ رہا۔ اس کے بعد گھر سے جا کر کچھ کھجوریں لے آئے۔ دودھ اور کھجوریں مہمانوں کو پیش کیں اور نہایت عجز و انکساری سے کہا:

"کاش! اس سے بہتر چیز اگر میرے پاس ہوتی تو میں آپ کو پیش کرتا۔"

مہمانوں کی تعداد چونکہ زیادہ تھی اس لیے نہ تو دودھ ہی کا ایک قطرہ بچا اور نہ ایک کھجور ہی۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اس رات میں کوئی چیز اپنی زبان پر نہیں رکھی اور صرف یہی نہیں عموماً آپ کی یہی عادت تھی۔ طبقات میں ہے کہ علیٰ بن عمیلہ الفزازی کہتے ہیں کہ مجھ سے اس شخص نے جس نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو دیکھا تھا بیان کیا۔

یحلب غنیمة ثم فیبدا بجیرنه واضیافه قبل نفسه۔

"اپنی بکریوں کا دودھ نکالتے اور اپنے نفس سے پہلے مہمانوں پر تقسیم کرتے۔"

اور ایک واقعہ یہ بھی آپ کا مشہور ہے کہ مہمانوں کو سیر کرنے کی غرض سے آپ نماز میں مشغول ہو گئے۔ جب ان کا پیٹ بھر گیا تب نماز سے فارغ ہو کر ان کے ساتھ شریک ہوئے۔ یہ واقعہ بھی ربذہ ہی کا تھا۔

صاحبِ "حلیہ" محمد بن واسع ناقل ہیں کہ وہ ایک دفعہ بصرہ سے بقصد ربذہ روانہ ہوئے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے مشاغل کو آپ کی حرم محترمہ سے دریافت کروں۔ استفسار پر بیوی صاحبہ نے ان کی مصروفیت کا صرف اسقدر جواب دیا۔

کان النهار اجمع یتفکر

"دن سارا تصور و تفکر میں گزرتا۔"

امراء بنی اُمیّہ کے متعلق کبھی یہ بھی فرماتے۔

"وہ مجھے قتل کی دھمکیاں دیتے ہیں حالانکہ اب زمین کا پیٹ اس کی پیٹھ سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔"

امراء بنی امیہ سے مراد دراصل وہی طبقہ ہے جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نیکیوں سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر خود اپنے آپ کو رسوا کیا۔ مصیبت یہ ہوئی کہ ان کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک خاص طبقہ میں خواہ مخواہ بدگمانیاں پیدا ہو گئیں۔ انساب الاشراف میں البلاذری نے لکھا ہے کہ مروان اور حارث بن الحکم بن عاص وغیرہ نے

عہد عثمانی میں بڑی بڑی رقوم حاصل کیں گو اس سلطنت گیری کے لحاظ سے وہ چنداں اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ بعضوں کو چالیس پچاس ہزار درہم مل گئے اور جو اسلامی حقوق زکوٰۃ ان پر عائد ہوتے تھے ان سے لاپرواہیاں برتنے لگے۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ "کنز" کے حرافی خمیازوں کی دھمکیاں علانیہ ان لوگوں کو سنانے لگے۔ اسی پر مروان حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا سخت مخالف ہو گیا تھا۔ (البلاذری ص ۵۶ ج ۵)

(طبقات ص ۱۷۰ ج ۴)

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ آپ کے زمانہ میں ربذہ کے عامل ایک حبشی غلام مجاشع تھے۔ جس طرح دنیاوی معاملات ان کے سپرد تھے جمعہ جماعات کا تعلق بھی ان ہی سے تھا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ یہاں آکر سکونت فرما ہوئے تو آپ بھی نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے۔ جب جماعت کھڑی ہو گئی تو مجاشع بوجہ اپنے غلام ہونے اور شرفِ صحابیت سے محروم ہونے کے آگے بڑھنے سے رُکے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ان کی یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ آگے بڑھو۔ جس طرح پہلے نماز پڑھاتے تھے اب بھی پڑھاؤ۔ مقصد اقدس یہ تھا کہ اگرچہ تم غلام حبشی ہو لیکن اولی الامر نے تم کو امیر بنا دیا ہے تو میں بھی تمہیں امیر سمجھتا ہوں جیسا کہ خود بعد کو آپ نے فرمایا۔

> "مجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر حبشی غلام بھی مجھ پر امیر بنایا جائے تو مجھ پر لازم ہے کہ میں اس کی باتیں سنوں اور اس کی فرمانبرداری کروں۔"

گویا اس خواب کی تعبیر ربذہ میں آکر پوری ہوئی اور یہ ایک اتفاقی بات ہے کہ آپ کے ربذہ آنے سے پہلے یہ غلام یہاں کے امیر تھے۔

عبداللہ بن سبا کو جب اس کی خبر ملی کہ امیرِ شام کی شکایت کی بنا پر خلیفہ اسلام نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو شام سے مدینہ بلوایا اور کعب الاحبار سے مناظرہ کرایا۔ حتیٰ کہ انہی وجوہ کی بنا پر بیابان ربذہ میں جا کر عزلت گزیں ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکے کارندوں نے اس واقعہ کو غلط رنگ دے کر ابن کے سامنے پیش کیا تو اس کو فوراً خیال گزرا کہ ایسی صورت

میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یورش پر آمادہ کیا جا سکتا ہے جبکہ مسئلہ کنز پر نزاع پہلے ہی موجود ہے اور پھر ابوذر رضی اللہ عنہ کا تقدس و ورع عام طور پر مسلمانوں میں مسلم ہے اور خود ان کے ساتھ ایک بڑا قبیلہ غفار کا ہے۔ کیا عجب ہے کہ ان کو شریک کار بنا لینے کے بعد ہماری سازش مکمل ہو جائے۔ اور جو آگ عبداللہ بن سباء نے سلگائی تھی اس کے شعلے ابوذر رضی اللہ عنہ ہی کے ہاتھ سے اسلامی آبادیوں تک پہنچا دیئے جائیں۔

غرض اسی قسم کے بیہودہ خیالوں کو سامنے رکھ کر اس نے ایک وفد تیار کیا۔ بقول ابن خلدون سرخیلِ وفد وہ خود آپ تھا۔ کوفہ میں اس مفسد وفد کا نظام مرتب کیا گیا اور یہیں سے ان بدباطنوں کی جماعت ربذہ روانہ ہوئی۔

بطور مہمانوں کے یہ لوگ آپ کے درویش خانہ پر آ کر ٹھہرے اور موقع پا کر ان میں سے ایک شخص نے اس طرح تقریر شروع کی۔

"اے ابوذر! اس شخص (عثمان رضی اللہ عنہ) نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا اس کے جواب میں کیا آپ تیار ہیں کہ اس کے خلاف آپ بغاوت کا پرچم بلند کریں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ جتنے آدمیوں کی آپ کو ضرورت ہو گی اس کا پورا انتظام کیا جائے گا۔ آپ صرف پرچم بلند کریں"۔

طبقات میں ان کی تقریر کا صرف اسی قدر حصہ مذکور ہے لیکن یہ مفسدین جس درجہ شاطر و عیار تھے اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ جو کچھ نقل کیا گیا اس سے کہیں زیادہ باتیں انہوں نے کہی ہوں گی۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ان کی تقریر سننے کے بعد فرمایا:

"خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں ایسا ہرگز نہ کروں گا۔ صبر کروں گا اور خدا سے اجر کی اُمید رکھوں گا"۔

باغیوں نے ربذہ کے درویش کا جواب سُنا تو اسی وقت راہِ گریز اختیار کی۔

اسی دوران میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس کو عوف شیبانی سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص تحفے تحائف لے کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس ربذہ آیا۔

جب وہاں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ آپ بقصدِ حج مکہ مکرمہ تشریف لے گئے ہیں۔ اس شخص نے بھی کعبہ کی طرف اپنے اونٹ کی مہار پھیر لی۔ اور منیٰ کے میدان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ملا۔ اسی دوران یکایک غُل ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں بجائے دو رکعتوں کے چار رکعتیں پڑھیں یعنی بجائے قصر کے نمازیں پوری پڑھیں۔

چونکہ یہ بالکل نیا واقعہ تھا اس لیے صحابہ میں برہمی پھیل رہی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب چار رکعت پڑھی تو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے آکر پوچھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟"

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

"میں نے بعض لوگوں سے سُنا کہ یمن کے کچھ لوگ اور بعض گنوار بدوؤں نے اپنے ملکوں میں جاکر مشہور کر دیا کہ نماز مقیم کے لیے بھی دو دو رکعتیں ہیں۔ یعنی دو ظہر کی اور دو عصر کی۔ کیونکہ امیر المومنین یوں ہی پڑھتے ہیں۔ یہ ایک سخت غلط فہمی ہے اس لیے اقامت کی نیت کرکے چار پڑھ لیں۔ اور وجہ اس اقامت کی یہ ہے کہ میں نے منیٰ میں نکاح کر لیا ہے اور یہاں سے طائف قریب ہے جہاں میری جائداد بھی ہے اس کی نگرانی کے لیے یہ بھی اقامت کر لیتا ہوں"۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اس پر معارضہ کیا جس کا جواب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دیا۔

(طبرانی ص ۵۷ ج ۳)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ایک طرف آپس میں مشورے کر رہے تھے۔ بار بار عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زبان پر یہ فقرہ آتا تھا۔

فلیت حظی من اربع رکعات رکعتان فتقبلتان

(بخاری)

"کاش چار رکعتوں کے ثواب سے مجھے دو ہی رکعتیں جو خدا کے نزدیک مقبول ہیں وہی ملتیں"۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس کا جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا:

الخلاف شر قد بلغنی انہ صلی اربعا فصلیت اربعا۔

خلاف بُری بات ہے۔ مجھے خبر ملی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار رکعتیں پڑھی ہیں اس لیے میں نے بھی چار پڑھیں۔"

جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو یہ خبر ملی تو آپ پر غصہ طاری ہو گیا سخت غیظ میں جھلا کر کہنے لگے۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں نماز پڑھی۔ آپ نے ہمیشہ دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی دو ہی پڑھیں۔ عمر رضی اللہ عنہ کے وقت میں بھی یہی ہوتا رہا۔"

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد آپ نے کچھ سخت الفاظ بھی استعمال فرمائے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد اٹھے اور اُٹھ کر آپ نے بھی چار رکعتیں ادا کیں یعنی قصر نہ کیا۔ ایک شخص وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً پوچھا۔

"آپ نے یہ کیا کیا۔ جس فعل پر آپ ابھی ابھی امیر المومنین کی شان میں سخت سُست سنا رہے تھے کس قدر عجیب ہے کہ کھڑے ہو کر پھر اسی فعل کے خود مرتکب ہوئے۔"

آپ نے جواب دیا۔

"جب خلیفہ چار رکعتیں پڑھے تو اب ہم پر بھی اس فعل کا کرنا ضروری ہو گیا ہے۔" (طبرانی ص ۵۷ ج ۳)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کوئی نجی اختلاف نہ تھا اور نہ دل میں ان کے خلاف کوئی کدورت و رنجش رکھتے تھے۔

ابتدا میں جب آپ بیابان ربذہ میں تشریف لائے تو بعض لوگوں نے آکر پوچھا۔

"آپ ربذہ کس طرح اور کیوں آئے ہیں؟"

آپ نے فرمایا:

"میں شام میں تھا۔ وہاں مجھ میں اور امیر شام میں آیت والذین یکنزون

الایہ میں اختلاف ہوگیا۔ امیرِ شام کہتا تھا یہ آیت یہودیوں کی شان میں نازل ہوئی ہے اور میں کہتا تھا کہ ہماری اور ان کی دونوں کی شان میں ہے۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ اس نے خلیفہ سے میری شکایت کر دی تو خلیفہ نے مجھے مدینہ بلا لیا۔ جہاں اس قدر ہجوم مجھ پر ہونے لگا کہ جیسے انہوں نے اس سے پہلے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ خلیفہ سے اس بات کا تذکرہ کیا گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر جی چاہے تو ربذہ چلے جاؤ تاکہ قریب رہو۔ بس اتنی بات مجھے یہاں لائی ہے۔" (طبقات ابن سعد)

آپ کا یہ بیان بڑا مجمل ہے۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس پر وہ کسی کے شاکی نہ تھے۔

وفاتِ ابوذر رضی اللہ عنہ

بیابانِ ربذہ میں ابوذر رضی اللہ عنہ بیمار پڑ گئے۔ اور مرض دن بدن بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ آپ کا آخری وقت قریب آ گیا۔ آپ کی بیوی اور بیٹی زار زار رونے لگیں۔ آپ نے نحیف و کمزور آواز میں پوچھا۔

"کیوں روتی ہو؟"

بیوی نے جواب دیا۔

"آپ ایک ایسے بیابان میں دم توڑ رہے ہیں جہاں کوئی جنازہ اٹھانے والا نہیں اور نہ کفن کے لیے کپڑا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔

"غم نہ کرو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ایک شخص ویرانے میں مرے گا اور اس کے جنازے میں مسلمانوں کی ایک جماعت شریک ہو گی۔

میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت سے فرمایا جس میں میں بھی تھا۔ ان میں سے ہر شخص مر چکا ہے۔ اور ہر ایک کسی گاؤں کسی شہر میں مرا۔ میں ہی وہ شخص ہوں جو ویرانے میں مر رہا ہے۔ خدا کی قسم میں نے نہ کبھی جھوٹ بولا اور نہ جھٹلایا گیا۔ جب میں مر جاؤں تو تم راستے میں جا کے بیٹھ جانا اور جو قافلہ ادھر سے گزرے کہنا کہ صحابی رسول ابوذر وفات پا گئے۔"

خدا کی ہر چیز خدا ہی کی طرف لوٹ جانے والی ہے۔ آخر ساعتِ موعود آ گئی۔ سراجِ منیر

احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار قدسیہ سے دمکنے والا ماہتاب ۸ ذی الحجہ ۳۲ھ کو اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت میں غروب ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ط

آپ کی حرم محترم بیاباں میں سڑک کے کنارے آپ کے ارشاد کے مطابق جا بیٹھیں کہ کوئی قافلہ ادھر سے گزرے تو مجذوبوں کے رئیس الطائفہ کے انتقال کی خبر دیں۔

ادھر کوفہ سے استاد المسلمین، معلم الامت، فقیہ الاسلام حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ عمرہ کا احرام باندھے ایک جماعت کے ساتھ مکہ مکرمہ کے ارادے سے تشریف لا رہے تھے ابن اثیر نے اس جماعت کے آدمیوں کے ناموں کی تفصیل یہ لکھی ہے :-

۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

۲۔ حضرت اسود بن یزید رضی اللہ عنہ

۳۔ حضرت مالک بن اشتر رضی اللہ عنہ

۴۔ حضرت علقمہ بن قیس نخعی رضی اللہ عنہ

۵۔ حضرت طلحہ جلتی رضی اللہ عنہ

۶۔ حضرت حارث بن سوید تمیمی رضی اللہ عنہ

۷۔ حضرت عمر بن عتبیٰ السلمی رضی اللہ عنہ

۸۔ حضرت ابن ربیعہ سلمی رضی اللہ عنہ

۹۔ حضرت ابو العرز تمیمی رضی اللہ عنہ

۱۰۔ حضرت ابو رافع مزنی رضی اللہ عنہ

۱۱۔ حضرت سوید بن شعبہ تمیمی رضی اللہ عنہ

۱۲۔ حضرت اخا القرتع الضبی رضی اللہ عنہ

۱۳۔ حضرت اخو معضد الشیبانی رضی اللہ عنہ

قافلہ والوں نے لب سڑک ایک عورت کو خستہ حالی میں بیٹھے دیکھا تو اونٹوں کو روک لیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ صحابی رسول مقبول وفات پا گئے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ حج کا موسم جبکہ ختم ہو رہا تھا اور ایام حج بھی گزر رہے تھے۔ ایسے وقت میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مکہ آنا ایک بے موقع سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان کو اگر آنا ہی تھا تو پھر چند دنوں کے لیے انہوں نے حج کی سعادت کیوں چھوڑی۔ پھر اس پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا۔

"دیکھتے رہنا کوئی آتا ہو گا۔"

عجیب اسرار ہیں جو علت و معلول کے سلسلہ میں کسی طرح درج نہیں ہوتے۔ حضرت مالک بن اشتر اپنا کفن سفر میں ساتھ رکھتے تھے۔ وہی کفن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو پہنا دیا۔ بیابان ہی میں ایک جگہ قبر کھودی گئی اور نماز جنازہ کے بعد بصد عزت و احترام آپ کو دفنا دیا گیا۔ قضا و قدر نے جو کچھ چاہا وہ ہوا۔

دفن کرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے رفقا کے ساتھ باچشم تر خیمہ میں آئے۔ آپ کی بیوی اور بیٹی کو تسلی و تشفی دی۔ طبری نے اس کے متعلق دو روایتیں درج کی ہیں۔ ایک میں یہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اہل و عیال کو ساتھ لیا اور مکہ معظمہ پہنچ کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔

اور دوسری روایت یہ ہے کہ پسماندگان کو تسلی دلاسا دے کر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اسی وقت مکہ معظمہ روانہ ہو گئے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اس جانکاہ حادثہ کی خبر دی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو سخت صدمہ ہوا اور آدمی بھیج کر آپ کے اہل خانہ کو مدینہ منورہ بلا لیا اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے بال بچوں کو اپنے بال بچوں میں شامل کر لیا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار مبارک بیابان ربذہ میں ابھی تک موجود ہے۔ وہی ابوذر رضی اللہ عنہ جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

"ابوذر تنہا چلے گا۔ تنہا مرے گا۔ اور روز حشر میں تنہا اٹھایا جائے گا۔"

اخلاصِ ابوذر رضی اللہ عنہ

قرآنِ حکیم انسانوں سے فرماتا ہے کہ وہ خالص طور پر اللہ کی عبادت کا دم بھریں۔ جو بلا اخلاص عبادت الٰہی میں مصروف رہے اسے اس عبادت کا سا اجر نہ ملے گا جس پر ثواب مترتب ہونے کا اللہ تعالیٰ نے قطعی و حتمی حکم صادر فرمایا ہے۔

اللہ نے منافقوں میں سے بشرطِ اخلاص اللہ سے رجوع کرنے والوں کو مومن عاملوں جیسی مقبولیت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ سے ظاہر ہے۔

سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے خلوص سے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ اپنی اصلاح کی۔ اللہ سے مضبوط تعلق قائم رکھا اور اپنی اطاعت و عبادت کو صرف اللہ کے لیے مخصوص کیا۔ پس وہی مومنوں ایسے سلوک کے مستحق ہوں گے اور مومنوں کو تو اللہ بہت بڑے اجر سے نوازیں گے۔

اخلاص کا یہ مفہوم بہت سی احادیث میں بھی بیان ہوا ہے اور ان میں سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک شخص رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ سے پوچھا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کی اس شخص کے متعلق کیا رائے ہے جو جہاد سے اجر اور شہرت کا خواہاں ہو؟"

آپ نے فرمایا۔

"اسے ایسے جہاد سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

اس حدیث سے یہ بات بصراحت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اخلاص سے عاری

اعمال کو قبول نہیں فرماتے۔ اخلاص درست اور صحیح اعمال کی بنیاد ہے۔ انسان صالح مومنوں کی صف میں اسی وقت شمار ہوتا ہے جب وہ اپنے عقیدے میں مخلص ہو اور خالق و مخلوق دونوں کے معاملہ میں بموجب حکم الٰہی اخلاص برتے۔

دین کا معاملہ تمام دو اصولوں پر منحصر ہے۔ اللہ کا فعل اپنے بندہ کے لیے اور بندے کا عمل اپنے رب کے لیے۔ جو بھی دوامی سعادت سے بہرہ مند ہونے کا متمنی ہو اسے چاہیئے کہ رضا الٰہی پر راضی رہے اور اللہ کے لیے جو کام بھی کرے اس میں اخلاص کو پیش نظر رکھے۔ پس دین کا دارومدار رضائے الٰہی اور دولت اخلاص پر ٹھہرا۔

دینی علمائے اخلاق نے حقیقتِ اخلاص کو بڑے عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اخلاص سے مراد عمل کو ہر اس عمل سے پاک کرنا ہے جس سے اس میں اختلاط شرک کا شائبہ ہو سکے۔ اس طرح وہ کام خاص اس سبب کے لیے محدود ہو جاتے جس کے لیے کہا گیا ہے۔ اور ضروری ہے کہ یہ سب دین کی نظروں میں درست اور قابلِ ستائش ہو۔

چنانچہ جب انسان کے عمل کا دارومدار سبب فاسد پر ہوتا ہے جیسا کہ اسکی عبادت سے غرض و غایت، شہرت و مرتبت یا مال و جاہ ایسی دنیوی لذات کا حصول ہو تو وہ اپنے رب کی عبادت میں مخلص نہ ہو گا۔ اس کا اخلاص تو اس شئے کے لیے ہو گا جس نے اسے عبادت کے واسطے تحریک کی۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اخلاص کا تعلق دل اور نیت سے ہے۔ اور نیت سے مراد وہ ارادہ ہے جو نفسی کیفیت کا مظہر ہو اور جس کے سبب انسان کسی فعل مرغوب کے حصول کی طرف مائل ہوتا ہے۔

جب انسانی ارادہ کا اپنے پسندیدہ فعل کی جانب میلان ہو تو اس کی جملہ توانائیاں اسے حاصل کرنے میں لگ جاتی ہیں۔ اگر کسی فعل سے متعلق ارادہ، ایسا صحیح محرک ہو کہ کوئی دوسرا سبب اس میں مزاحم نہ ہو تو یہ خالص اور درست نیت ہو گی اور اس حال میں اس پر مرتب ہونے والا عمل فعل کہلائے گا۔

مثلاً جب انسان جہاد فی سبیل اللہ یا حج بیت اللہ کا ارادہ کرے تو قدرتی بات ہے

کہ اس کے تمام اعضا اس فعل کے حصول میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جہاد یا حج بیت اللہ سے متعلق مختلف مروجہ اغراض میں سے صرف ایک غرض اس کے ارادہ میں پوشیدہ ہوگی۔ وہ اگر اللہ کی رضاجوئی تک محدود ہو تو سمجھ لو کہ نیت صحیح ہے اور اس پر مرتب ہونے والا فعل، پُراز خلوص اور اس کا عامل بندۂ اخلاص ہے۔

اسی طرح اگر مجاہد کی نیت جہاد سے اس اجر و ثواب کا حصول ہے جس کا اللہ تعالےٰ نے مجاہدین سے وعدہ فرمایا ہے تو یہ سبب بھی اللہ کی رضاجوئی کے مترادف ہے اور اگر جہاد سے مقصود ثواب اور اس تمنا کا حصول ہے کہ لوگ اسے بہادر اور سرفروش کہیں اور اس کی قدر و منزلت لوگوں کی نظروں میں بڑھ جائے تو اس سے یہ عمل مبنی بر اخلاص نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ارتکابِ فعل پر اس کی نظر دو اغراض پر مرتکز تھی۔

۱۔ ثواب کی نیت

۲۔ لوگوں کی نظروں میں اعلیٰ مقام کا حصول

دین کی نظر میں دوسرا سبب قابلِ تحسین نہیں۔ ایسا کرنے سے سارا عمل ضائع و بیکار ہو جاتا ہے۔

اخلاصِ عمل یہ ہے کہ کسی فعل کو سرانجام دینے والا اس کے معاوضے کا تقاضا نہ کرے۔ بلکہ اسے خاص اس دینی غرض سے پایۂ تکمیل کو پہنچائے جس نے اس کی تحریک کی۔

پس کسی معاملہ میں اخلاص کا حصول کافی آسان ہے بشرطیکہ نفسِ انسانی کی تہذیب و تربیت اس طرز پر ہوئی ہو کہ وہ فضائل کو پسند کرے اور رذائل سے نفرت کرے۔ اور اکثر اوقات غیر مخلص عمل پاکیزہ طبائع پر گراں گزرتا ہے۔

ان کو حقیقی لذت اسی کام میں ملتی ہے جو انہوں نے خالصتاً خدا کے لیے کیا ہو۔ ابوذر رضی اللہ عنہ جب سے اسلام لائے ان کی پوری زندگی نظر کے سامنے ہے۔ ساری زندگی خدا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے ساتھ مخلص رہے۔ ان کا اخلاصِ عمل یہ

ہے کہ دین مبین کی نشر واشاعت میں کبھی کسی معاوضے کا تقاضا نہ کیا۔ بلکہ اسے خاص دینی غرض سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور انہیں حقیقی لذت اسی کام میں ملی جو انہوں نے خالصتہً خدا اور رسول کے لیے کیا۔

اخلاقی تربیت میں قبیح ترین بات یہ ہے کہ انسان نیکی اور تقویٰ کے کاموں کی بجائے رذیل خواہشات کا طالب ہو۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا ہر کام نیکی اور تقویٰ پر مبنی تھا۔ رذیل خواہشات ان کے قریب کبھی پھٹکنے نہ پائیں۔

اخلاص اللہ کی جانب سے انسانوں پر واجب کردہ فضائل اخلاق میں سے ایک فضیلت ہے۔ جس سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ متصف تھے۔ جسے اپنی عمر میں اخلاص کا ایک لمحہ بھی نصیب ہو گیا وہ نجات پا گیا۔

علمائے اسلام نے اخلاص کو اتنی اہمیت دی ہے کہ یہ دوسری تمام اخلاقی فضیلتوں سے فائق ہے۔ اسلام لانے کے بعد ابوذر رضی اللہ عنہ سراسر اخلاص کے سانچے میں ڈھل گئے تھے۔ وہ تو اخلاص کے پُتلے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اخلاص۔ اسلام کے لیے اخلاص۔ مسلمانوں کے لیے اخلاص۔ آپ نے اخلاص کے شرعی حکم پر ہمیشہ پابندی سے عمل کیا۔

بُت پرستی اور اس سے متشابہ چیزوں سے اجتناب کیا۔ اعمال حسنہ پر دائماً کاربند رہے۔

دین اسلام میں بندگی کے لیے خدا کی ذات ہی مخصوص ہے۔ کیونکہ اکیلا وہی مستحق عبادت ہے۔ اپنے فعل تکوینی میں وہ نہ صرف موجد عالم ہے بلکہ ان تمام وسائل کا بھی ایجاد کرنے والا ہے جن پر ایک معینہ مدت تک بقائے عالم کا دارومدار ہے۔ وہی خلاقی و رزاقی کی صفات کا حامل ہے۔

وہ بت وہ جھوٹے معبود جنہیں عبادت و پرستش میں معبود حقیقی کے ساتھ شریک کیا جاتا ہے وہ خود خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔ وہ کسی شے کو عدم سے وجود میں لانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ پس ایسوں کی عبادت کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ اور اس حقیقت کو

ابوذر رضی اللہ عنہ نے رہزنی سے توبہ کرنے اور اسلام لانے سے پہلے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ ارباب من دون اللہ کے پجاریوں سے تھے۔

شریعت اسلامیہ نے اعماد دینی کو غیر شرعی اسباب پر مبنی کرنے سے منع کیا ہے۔ جنہوں نے بُت پرستی یا اس سے متشابہ کو عادتاً یا تقلیداً اختیار کر رکھا ہو اس سے بہت سختی سے روکا گیا ہے۔

اسلام کا مقصدِ وحید بُت پرستی اور شرک کے خلاف مختلف طریقوں سے متحدہ محاذ قائم کرنا ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے سے پہلے اور اسلام لانے کے بعد بتوں کے خلاف محاذ قائم رکھا۔ یہ آپ کا ایک عظیم اسلامی کارنامہ ہے کہ آپ نے سرمایہ داری کے نہ صرف بُت بلکہ ہیکل کو نظریۂ کنز کے ہتھوڑوں کی ضربات سے پاش پاش کر دیا۔

دین نے درختوں، پتھروں، ہیکلوں اور ان سے مشابہ اشیاء کی تعظیم و تکریم سے بڑی سختی سے منع کیا ہے اور لوگوں پر یہ بات واجب کر دی ہے کہ وہ خالص طور پر اللہ کے ہو کر رہیں۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ وادی غزال سے بیابانِ ربذہ تک اللہ کے ہو کر رہے۔

ابوذر رضی اللہ عنہ کے اعمالِ حسنہ

دین نے عمل صالحہ کے متواتر و مسلسل اکتساب کے لیے ہر فضیلت کے اکتساب کا حکم دیا ہے۔ ہر رذیل شے سے منع کیا ہے۔ اس میں تمام انسانوں کے لئے سعادت دارین حاصل کرنے کی تحریک ترغیب مضمر ہے۔

اسلام نے ان تمام نیک اعمال کا حکم دیا ہے جس پر قوموں کی بقا و غلبہ اور شان و شوکت کا انحصار ہے۔ مزید برآں اعمال حسنہ کے ضمن میں باہمی اتحاد و تعاون فرض ٹھہرا دیا ہے۔ حاجت مندوں کے لیے محبت و الفت کا حکم دیا ہے۔ امراء کے مال میں غریبوں اور ناداروں کے لیے ایک معین مقدار مقرر کر دی ہے۔ اور ان کے اموال میں مسکینوں اور محتاجوں کے لیے ایک معین حصہ شامل ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ اس اسلامی مساوات کے سب سے بڑے داعی و نقیب تھے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ابوذر رضی اللہ عنہ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

آپ رذیل شے سے منع کرتے رہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کے شب و روز یہی نعرہ لگاتے ہوئے گزرے کہ اے لوگو امر بالمعروف ہی میں انسانوں کے لیے سعادت دارین حاصل کرنے کی تحریکِ ترغیب مضمر ہے۔

اسلام ان تمام نیک اعمال کا حکم دیتا ہے جن پر قوموں کی بقا، غلبہ اور شان و شوکت کا انحصار ہے۔ مزید براں اعمال حسنہ کے ضمن میں باہمی اتحاد و تعاون فرض ٹھہرا دیا ہے حاجت مندوں کے لیے محبت و الفت کا حکم دیا ہے۔

امراء کے مال میں غریبوں اور ناداروں کے لیے ایک معین مقدار مقرر کر دی ہے اور ان

کے اموال میں مسکینوں اور محتاجوں کے لیے ایک معین حصہ شامل ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ اسلام کے اس پیغام اور خدا کے اس حکم کو انسانوں تک پہنچاتے رہے۔

آپ نے لٹنے والے سائلوں کی امداد، غمزدوں کی حاجت روائی، کمزوروں کی اعانت اور مظلوموں کی پشت پناہی کی ہمیشہ پُر زور تائید کی۔ انسانوں کے باہمی تعلقات استوار کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

صلہ رحمی ــــ ہمسایوں کے حقوق کی رعایت ــــ راست بازی ــــ عفت و عصمت ــــ انصاف ایسے اجتماعی اعمال کا پیغام نگر نگر دیا۔

آپ نے فرمایا۔

- جن اعمال صالحہ پر اجتماعی فلاح و بہبود اور دینی و دنیوی سعادت موقوف ہے انہیں دوام و بقا بخشنا از حد ضروری ہے۔
- اعمال صالحہ سے انسان کا تغافل و تساہل برتنا مضر و مہلک ہے۔
- اعمال صالحہ اس وقت تک دوامی اور ابدی بقا حاصل نہیں کر سکتے۔ جب تک اُن کا سبب قوی اور مستقل نہ ہو۔
- نیکی اور تقویٰ کے تمام کام جبتک کسی دوامی و پائدار سبب پر مبنی نہ ہوں تو وہ اس سبب کے منقطع ہوتے ہی ختم ہو جاتے ہیں، باقی نہیں رہتے۔
- جس کی ہجرت و جہاد کا باعث اللہ اور اس کا رسول ہے تو اس کی ہجرت و جہاد اللہ اور رسول کے لیے ہے اور جس کی ہجرت و جہاد میں دنیوی مقصد مضمر ہے تاکہ اسے حاصل کرے تو ایسی ہجرت و جہاد ہر اس شے کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔
- نیکی اور تقویٰ کے تمام کام جبتک کسی دوامی و پائیدار سبب پر مبنی نہ ہوں تو وہ اس سبب کے منقطع ہوتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔
- یہ بات اصول دین اور دستورِ الٰہی کے سراسر منافی ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں سے ثابت ہونے والے اعمال صالحہ سے ایک رائی برابر عمل بھی ضائع کرے۔
- فرمان الٰہی ہے کہ جس نے ایک ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے

ایک ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اس کے سامنے آجائے گی۔

- اے لوگو! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم قیامت کے روز عدل و انصاف کے ترازو نصب کریں گے۔ کسی نفس پہ ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اگر رائی کے دانہ کے برابر شے ہوگی تو اسے بھی ظاہر کر دیا جائے گا۔
- اگر کسی دنیوی کام کو محض خواہشاتِ نفسانی سے متمتع ہونے کے لیے کیا جائے اور اللہ کے حکم کا مطلقاً احترام ملحوظ نہ رکھا جائے یعنی اس عمل کی تحریک ہوائے نفس کی تسکین نے کی ہو اور اللہ کی عبادت کو اس نفسانی لذت تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا گیا ہو تو ایسے عمل کا ذمہ دار شخص درحقیقت منافقین میں سے ہے اور سخت گناہ گار ہے۔
- دین اسلام کے اصول اعمال حسنہ کی ترغیب دیتے ہیں اور اعمال خیر کرنے والوں کی عظمت کا تقاضا کرتے ہیں۔
- اگر کسی نیک کام کرنے کا ارادہ کیا اور کسی وجہ سے اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا تو اللہ تعالیٰ اسے مکمل نیکی کا اجر عطا کرے گا۔ اور اگر ارادہ کرنے کے بعد اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دے تو اللہ تعالیٰ اس کو بہت سی نیکیوں کے اجر سے نوازتے ہیں۔
- عامل اپنے نیک عمل کے اجر سے محروم نہیں رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے عمل میں نقص یا خرابی کے باعث اسی اندازہ سے ثواب میں کمی کر دی جائے۔
- یہ بڑی بے ادبی اور گستاخی ہے کہ انسان کام تو کرے نفسانی لذتوں کے حصول کے لیے اور پھر اس کا اجر اللہ سے طلب کرے۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزِ قیامت جس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک نہیں، جب اللہ تعالیٰ متاخرین و اولین کو اکٹھا کریں گے تو منادی کرنے والا پکارے گا کہ جس کسی نے اپنے اعمال میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کیا تھا تو وہ اس عمل کے ثواب کا اسی شخص سے تقاضا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ شرک کا ڈھنگ اختیار کرنے والوں کے شرک سے بے نیاز ہیں۔

- دین اسلام خالص توحید کا حکم دیتا ہے اور بتوں کا استیصال کرنے آیا ہے۔ یہ لوگ اس کے خلاف اپنی خواہشات کے بتوں کو پوجتے ہیں۔
- جس نیک کام کی تحریک میں اللہ کے سوا کوئی اور بھی شریک ہو تو اسے اللہ سے اس عمل کے اجر کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اس نے وہ کام خالصتاً اللہ کے لیے نہ کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے کام سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ جس میں کسی دوسرے کو اس کے ساتھ شریک کیا گیا ہو۔

ابوذر رضی اللہ عنہ کی قولی و قلبی عبادت

اعمال حسنہ جیسے جہاد، حج، روزہ، نماز، زکوٰۃ میں سے کچھ اعمال ایسے بھی ہیں جن کا تعلق قولی اعمال سے ہے اور قولی اعمال کہلاتے ہیں۔ اور جن کا دل سے واسطہ ہے وہ اعتقادی و قلبی اعمال کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں جبکہ قولی عمل کبھی تو ایک سبب پر منحصر ہوتا ہے اور کبھی دو پر۔ پس ہر متکلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے قول کو صرف ایک صحیح سبب تک محدود رکھے اور یہ حصول رضا الٰہی ہے۔ اگر دینی قول سے محض دنیوی غرض مقصود ہو تو یہ بلاشبہ گناہ ہوگا جیسے کوئی شخص کسی بزرگ کے مزار پر محض اس لیے تلاوت قرآن اور ذکر اذکار جاری رکھے کہ لوگ اسے نیک سمجھیں اور اس بنا پر وہ مال و دولت یا جاہ و مرتبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے یا وہ لوگوں میں قاری و ذاکر مشہور ہو جائے۔ اور ان کے علاوہ اس کے پیش نظر اور کوئی غرض نہ ہو تو یہ نیکی کے کاموں میں کھلی منافقت ہے اور ایسا کرنے والا بہت بڑی سزا کا مستوجب ہوگا۔

اسی طرح جو شخص کلمہ حق ادا کرنے سے باطل کا آرزو مند ہو یعنی نیکی کی آڑ میں برائی کرنا چاہتا ہو تو وہ اپنے اس رویے سے صریح گناہ کا مرتکب ہوگا کیونکہ شارع علیہ السلام نے ہر اس قولی عبادت سے سختی سے منع فرمایا ہے جس کی دین نے تائید و توثیق نہیں کی۔ اس طرح آپ نے ان تمام اقوال سے باز رہنے کی تلقین فرمائی جس سے نفسانی خواہشات میں انگیخت ہوتی ہے۔ اس لیے ہر مرد و عورت پر ایسا کلام حرام ٹھہرا دیا گیا جس میں رضائے الٰہی مضمر نہ ہو۔ جیسے ایک ظالم کی اس لیے مدح و ستائش کی جائے کہ اس سے کوئی دنیوی غرض وابستہ ہو حالانکہ وہ کسی تعریف و توصیف کا مستحق نہ ہو۔ یا کسی شخص کی

انتقامی جذبہ کے تحت مذمت کی جائے جبکہ اس میں کوئی ایسی بُرائی نہ ہو جس کی وجہ سے اس کی مذمت کی گئی یا جھوٹ تردید حق کے لیے بولا جائے۔ یا دروغ سے ذاتی غرض کا حصول مقصود ہو۔ جو بھی ایسے قول و فعل کا مرتکب ہو گا وہ عنداللہ مجرم اور بدترین عذاب کا سزاوار ہو گا۔

اب رہی قلبی عبادت تو اس کا تعلق عقائد سے ہے۔ اگر کوئی عقیدہ کسی وقتی سبب کی بنا پر قائم کیا گیا ہے اور سبب رفع ہونے کے ساتھ عقیدہ بدل جاتا ہے تو وہ ایسا کاذب عقیدہ ہو گا جیسا عہد نبوی کے منافقوں کا عقیدہ تھا کہ وہ محض مالِ غنیمت سے زیادہ حصہ پانے یا مسلمانوں کی سخت گیری سے نجات حاصل کرنے کے لیے اللہ اور رسول پر ایمان کا اظہار کرتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ریاکاری ہے عیاری ہے۔ نمائش کی قبیح ترین شکل ہے۔ اس لیے نفاق فی العقیدہ بہت بڑا فساد ہے۔ کیونکہ اسے اپنی رذیل خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بطور ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر عقیدہ اللہ سے متعلق ہے تو اس کی بنیاد اس بات پر ہونی چاہیئے کہ عالم کون و مکان کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

وہی معبود، واجب الوجود ہے۔ اور جملہ صفاتِ کمالیہ کا مالک ہے۔ وہی انسانوں اور ان کے جملہ وسائل کا موجد ہے۔ جس پر اس دنیا میں بقاء انسانی کا ایک معینہ مدت تک دارومدار ہے اور جس پر آخرت کی دائمی اور ابدی بقاء کا انحصار ہے۔

استحقاق معبودیت کے لیے اشد ضروری ہے کہ اس کے علاوہ اور کسی کو خالق و رازق نہ سمجھا جائے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی نے اللہ کی صفات خالقیت و رزاقیت میں کسی کو شریک نہ کیا۔ کئی بار آپ کو تحفہ تحائف کی صورت میں مال و زر پیش کیا گیا لیکن آپ نے ٹھکرا دیا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی خلاقیت و رزاقیت کا آسرا تھا۔ کسی کے دستِ نگر نہ ہوئے۔ ان سے نہایت پُرآشوب و ناساعد حالات میں بھی کبھی کوئی ایسی لغزش نہ ہوئی جو مقامِ معبودیت کے تقاضوں کے خلاف ہو۔

آپ کی فہم و فراست میں یہ بات ہرگز زیب نہ دیتی تھی کہ آپ اس کے سامنے سر جھکائیں جو کسی شے کو بھی زیورِ آفرینش سے آراستہ کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو۔

آپ کے نزدیک ایسی ذات جو محدود الصفات ہو معبود بننے کی ہرگز مستحق نہ تھی۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پہ عقیدہ و ایمان کے لیے آپ کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ یہ ان مسلمہ اور روشن دلائل پر مشتمل ہو جو آپ نے اثبات رسالت کے لیے پیش کی تھیں۔ جو کوئی دنیوی اغراض کے حصول کے لیے دینی عقیدہ کا غلط اور جھوٹا اظہار کرتا ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے نزدیک وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے انکاری تھا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ تھا۔

اگر اعتقاد کا تعلق دینی اصولوں کے علاوہ کسی اور شے سے ہو تو اس کے دو پہلو ہیں۔

۱۔ اعتقادی اصولوں کی عقلی توجیہ

۲۔ اخلاص کو دلائل عقلیہ پر پرکھنا

پہلے سلسلہ میں کسی طرح جائز نہیں کہ دین کے تاکید کردہ اصولوں کے علاوہ کسی پر اعتقاد رکھا جائے۔ جیسے کسی مستقل زانی، شرابی اور بے نمازی کو ولی اللہ ماننا خواہ اس سے کتنی کرامات ہی کیوں نہ ظاہر ہوں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے نزدیک ایسے شعبدے ولایت کا درجہ نہ رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ولایت کی نشاندہی تو ایمان، تقویٰ اور اللہ کی منع کردہ چیزوں سے اجتناب یا امر الٰہی کی اطاعت سے ہوتی ہے۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے کھلم کھلا نافرمانبرداروں میں ولایت کا وجود مانے وہ گنہگار ہے۔ کیونکہ یہ بات قواعد دین کے خلاف ہے۔

دوسرے سلسلہ میں ضروری ہے کہ اگر کسی متقی اور پرہیزگار کو درجہ ولایت پر مانتے ہیں تو اس کا ادب و احترام اس کے اخلاق حسنہ اور صفاتِ حمیدہ کی بنا پر کریں۔ کیونکہ یہی صفات عند اللہ مقبول ہیں۔ کسی غیر شرعی امر کی وجہ سے اس کا احترام جائز نہ ہوگا۔ اور ایسا عقیدہ رکھنے والا مخلص نہ ہوگا اور اگر اس کی محبت اور حسن اعتقاد کی بنیاد عند اللہ پسندیدہ صفات پر مبنی ہوگی تو وہ اپنے دعویٰ میں مخلص ہوگا اور اس کے لیے اجر الٰہی کا مستحق ہوگا۔ آپ سے کبھی کوئی ایسا غیر شرعی امر سرزد نہ ہوا جس نے آپ کے حسن اعتقاد اور عند اللہ پسندیدہ صفات کو مشکوک کر دیا ہو۔

آپ نے اپنے اعمال کی بنیاد ان اسباب پر رکھی تھی جنہیں شرع نے خالق و مخلوق کے درمیان مقرر کیا ہے۔ آپ نے ہر کام خالصتاً اللہ کی رضاجوئی کے لیے کیا۔ کیونکہ وہی اعمال میں اخلاص برتنے والوں کی جزا و عطا کا کفیل ہے۔

آپ نے دین کے لیے ہر کام خلوص نیت سے کیا لیکن آپ کے دل میں کبھی ایسے خیالات پیدا نہ ہوئے جو اخلاص کے منافی ہوں۔ آپ نے اس دولت اخلاص کو بچانے کے لیے نامساعد حالات اور دشمنوں کی مخالفتوں کا حتی المقدور مقابلہ کیا۔ اخلاص سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی دولت نہیں۔ یہ اجر و ثواب میں لحہ بہ لحہ بڑھتی رہتی ہے۔ اسے نہ کوئی شمار کر سکتا ہے نہ لوٹ سکتا ہے، نہ چھین سکتا ہے۔ اس دولت کو جمع کرنے میں نہ روزمرہ کے معمولات کو بدلنا پڑتا ہے نہ اس پر کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ یہ روحانی دولت انسان کے اس وقت کام آئے گی جب دنیا کی تمام مادی دولتیں ساتھ چھوڑ دیں گی۔ اور ان کے ورثہ میں چلی جائیں گی جنہیں وہ زندگی میں ایک کوڑی بھی نہ دینا چاہتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اس روحانی دولت کے ایک بہت بڑے ساہوکار تھے۔ آپ نے فقیری میں بھی جہانگیری کی اور اس روحانی دولت کو مٹھیاں بھر بھر کر دنیا میں لٹایا۔

ابوذر رضی اللہ عنہ کا جہاد

زندگی میں جہاں تعمیری صلاحیتیں ہیں وہاں تخریبی قوتیں بھی ہیں۔ اگر زندگی اپنی تخلیق کے لیے عناصر کی ترتیب و تنظیم کو کام میں لاتی ہے تو اپنی بقا کے لیے انہی عناصر سے جدال و جہاد بھی کرتی ہے۔

زندگی کے عمدہ ترین مظہر یعنی انسان کے ظاہری اعضا کی ساخت اور فطری جذبات کی بعض خصوصیات اس امر پر دال ہیں کہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ساتھ باہمی نزاع و قتال کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور فرزندانِ حضرت آدم ہابیل و قابیل کے ہلاکت آفریں خونچکاں معرکہ کی ابتدا سے افزائش نسل سے ہمکنار یہ سلسلہ بڑھتا ہوا افراد، قبائل اور اقوام و ملل کی جنگوں کی صورت میں نمودار ہوا۔

ابتداءً یہ جذبہ استبداد و اقتدار کی ہوس کارانہ مساعی اور بہیمانہ کشت و خون میں جلوہ گر ہوا۔ فراعنہ مصر کی لشکر کشائی ـــــ بابل اور اسیریا کے نمارده کی ہنگامہ آرائی ـــــ نینوا کی خون ریزی ـــــ اہل ٹرائے اور یونان کی رزم گستری ـــــ ایران اور توران کی آویزش ـــــ روما اور کارتھیج کی جنگ و جدل یہ سب ہوس رانی کے عواقب تھے۔ جو استحصال زر، زمین، زن کی خواہش کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئے۔

ان میں کوئی اصول کارفرما نہ تھا۔ اسلام دنیا کا سب سے پہلا مذہب ہے جس نے جنگ کے اصول وضع کیئے۔ اور ان پر عمل کر کے اسلام کے نام لیواؤں نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ انسان اگر چاہے تو عین جنگ کے عالم میں بھی شرافت و دیانت سے کام لے سکتا ہے جو شرف انسانیت کی بنیادی خصوصیت ہے۔

قرآنِ کریم کے نزدیک جنگ کا اصل مقصد اصلاح و ہدایت ہے قہر و غلبہ نہیں ۔
امام باہلی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے متعدد بار حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کیا جنگ منفعت کے لیے روا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بار یہی جواب دیا کہ جنگ سے کوئی نفع نہیں۔ اسلام میں جنگ کی اصل غائت اللہ کی خوشنودی ہے باطل کی حمایت نہیں۔ جیسا کہ ارشاد ربانی سے ظاہر ہے۔

"جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کرلی ہے وہ باطل کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اس لیے شیطان کے معاونوں سے لڑو۔" (سورۃ النساء : ۷۵)

جنگ اسلامی تصوّر میں قتال بامقصد ہے اور مقصد کے حصول کے بعد منع ہے ۔
"اگر (کفار) فساد سے باز آجائیں تو ان پر کسی طرح کی زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔" (بقرہ : ۲۴)

اسی وجہ سے اسلام کے نزدیک جنگ متحارب اقوام کے تعلق کی ایسی صورت ہے جس میں مسلح افواج کا تصادم رہتا ہے مگر ملک کی دوسری آبادی کا جان مال اس کی زد سے باہر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی تائید حضور علیہ السلام کے ان الفاظ سے ہوتی ہے جو آپ نے بازنطینی حکومت کے خلاف لڑائی پر جانے والے لشکر کے قائد حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے فرمائے۔

"تم اپنی تلوار صرف اس کے خلاف اٹھاؤ جو اپنی تلوار تمہارے برخلاف اٹھائے۔ فقط اس سے لڑو جو تم سے لڑے۔ اپنا ہاتھ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر نہ اُٹھاؤ۔ بلکہ ان سے مہربانی سے پیش آؤ۔ ان کے آدمیوں سے جو عبادت گاہوں میں بیٹھے اپنی طرز پر عبادت کر رہے ہوں تعرض نہ کرنا۔ فصلوں کو برباد نہ کرنا۔ درختوں کو نہ کاٹنا۔"

جہاد ابتدائے ہجرت میں فرض ہوا اور اس کی مذکورہ بالا پہلی اور بنیادی آیت اس وقت نازل ہوئی جب قریش مکہ کے مظالم سے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا تھا۔

تیرہ برس تک مسلمانوں پر اس قدر ظلم و ستم ہوا کہ وہ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ فقط یہی نہیں غربت میں بھی انہیں سکون نہ ملا۔ ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔ قصور اُن کا صرف یہ تھا کہ وہ اللہ کا نام لیتے تھے۔ ان مظلوموں کو اگر مدافعت کا حق نہ دیا جاتا تو اعتقاد و عمل کی آزادی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ لڑائی کا حکم ضرورت و مصلحت کے تحت دیا گیا تا کہ جبر و جارحیت کی مدافعت ہو سکے۔

جنگ کی دوسری وجہ جواز قرآنِ حکیم نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔

"جو لوگ تم سے لڑتے ہیں ان سے خدا کی راہ میں جنگ کرو اور ان ظالموں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور جہاں سے انھوں نے تمہیں نکالا ہے اُن کو وہاں سے نکال دو۔ کیونکہ فتنہ پیدا کرنا قتل سے بھی بُرا ہے۔ تم ان سے برابر جنگ کئے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ اگر وہ فساد کرنے سے باز آجائیں تو پھر ان ظالموں پر کسی طرح کی زیادتی نہیں کرنی چاہیئے۔" (سورۂ بقرہ)

اسی حکم کو سورۂ انفال میں دہرایا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قتال و جہاد کی سنگین اور محدود صورت ہے اور یہ اس وقت پیش آتی ہے جب اس کے بغیر چارہ نہ رہے۔ جہاد اس پر مستزاد جدوجہد ہے جو اللہ کی راہ میں دین کی سربلندی اور دشمنانِ دین کی سرکوبی کے لیے کی جائے۔ جہاد کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں وسعت دی ہے۔

"جو لوگ اللہ کی راہ میں ایمان لائے۔ ہجرت کی اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا تو یقیناً اللہ کے نزدیک اُن کا بڑا درجہ ہے۔"

(سورۂ توبہ)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ پہلے تو حضور علیہ السلام کے ارشادِ گرامی کے مطابق اپنے قبیلے اور آس پاس کے قبیلوں میں لسانی جہاد کرتے رہے۔ تبلیغ دین کرتے رہے۔ لہٰذا غزوۂ خندق تک وہ حق و باطل کے معرکے میں نظر نہیں آتے لیکن اس کے بعد تمام غزوات میں جہاد بالسیف کیا۔ شہادت کی تمنا اور اس کا شوق اس درجہ تھا کہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"قسم ہے اس ذات کی! جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں۔ پھر مجھے زندہ کر دیا جائے اور پھر میں قتل کیا جاؤں۔ پھر مجھے زندہ کیا جائے اور پھر میں قتل کیا جاؤں"۔

یہ ثواب و فضیلت صرف اسی پر موقوف نہیں کہ انسان اللہ کی راہ میں مارا جائے۔ بلکہ اگر دین کی وجہ سے کسی ایمان والے کو ستایا گیا، بے عزت کیا گیا۔ مارا پیٹا گیا یا اس کا مال لوٹا گیا یا کسی اور طرح سے اس کو نقصان پہنچایا گیا تو ان سب کا بھی اللہ کے ہاں بہت بڑا ثواب و اجر ہے۔

اور ابوذر رضی اللہ عنہ بھی کچھ کم نہ ستائے گئے۔ انہیں بے عزت کیا گیا۔ مارا پیٹا گیا۔ انہیں کئی طرح سے نقصان پہنچایا گیا۔ جس کے اجر و ثواب میں اللہ نے انہیں ایسا رتبہ دیا کہ بڑے بڑے عابد و زاہد ان پر رشک کریں گے۔

اسلامی اعتدالی نظام

اسلام چونکہ دین فطرت ہے۔ اس لیے اسلام نے اپنے معاشی نظام میں بھی فطرتِ انسانیہ کا لحاظ رکھا اور تمام فطری امور کو اپنی حالت پر رہنے دیا۔ البتہ جہاں کہیں ان میں کجی اور بے اعتدالی واقع ہوئی اس کا ازالہ کر کے اس کو اعتدال پر لایا گیا۔

اسلام کے معاشی نظریہ کے خلاف اکتنازیت اور اشتراکیت کے معاشی نظریات میں چونکہ بے اعتدالیت اور فطرتِ انسانی کے حدود سے انحراف موجود تھا۔ کیونکہ یہ دونوں نظریات جذباتی تھے اور جذباتی نظریات کے لیے فطرت کی حدود شکنی لازمی ہے۔ اس لیے اسلام نے اپنا معاشی نظام ایسا معتدل اور موافق فطرت رکھا کہ اس میں انسان کے تمام طبقات کا معاشی تحفظ اور حقوق کی رعایت بھی موجود رہی اور سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کی تمام خامیاں بھی اس میں سے دُور کی گئیں۔

اسلام نے اپنے معاشی نظام میں ان تمام دروازوں کو بند کیا جن سے عوام کی معاشی حالت متاثر ہوتی تھی۔ اور جن سے سرمایہ دار غریب طبقے کا خون چُوستے اور ان تمام امور کی بھی مخالفت کی گئی جن سے انسانی حریت اور شرافت اور خود مختارانہ جوشِ عمل پر بُرا اثر پڑتا تھا۔

مال کے ارتکاز و تعطل کو اس نے حرکت میں تبدیل کیا اور غربا میں امراء کے خلاف حسِّ عدوانی کو تیز کرنے کے بجائے حسِّ ایمانی اور اخلاق کے ذریعہ دونوں میں محبت کا ربط قائم کر کے فقرا کے حقوق کو محفوظ کیا اور بجائے غیر فطری مالی مساوات کے امراء اور غرباء میں اکتسابِ رزق میں اسلامی مساوات کو قائم کیا اور قوانین عدلیہ میں امیر و غریب اور

شاہ وگدا کو برابر رکھا اور ایسے امور میں جو انسانی جدوجہد کی پیداوار نہیں اور جن پر انسانی سعی و عمل اور محنت کے ذریعہ سے جائز طریقے سے بالذات یا بالواسطہ کسی انسان کا قبضہ نہ ہوا ہو ان کو سب انسانوں کی مشترک ملکیت قرار دیا۔

یہ وہ دس اصول ہیں جن پر اسلام کے معتدل معاشی نظام کی عمارت قائم ہے۔ اشتراکی معاشی نظام میں غیر فطری مصنوعی مالی مساوات ہے اور سرمایہ دارانہ نظام میں غیر فطری تفاوت ہے۔ اسلام نے اعتدال قائم کیا اور دونوں کی تردید کی۔ مصنوعی مساوات کی تردید کی کہ وہ خلاف فطرت ہے۔ قدرت نے انسان میں دولت کی تخلیقی قوت میں فرق رکھا ہے۔ اس لیے سب انسانوں کی فکری اور جسمانی قابلیت برابر نہیں اور نہ عملی قوت یکساں ہے۔ انہی دو قوتوں کے فطری تفاوت کی وجہ سے انسانی طبقات میں مالی تفاوت کا رونما ہونا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فکری اور جسمانی قابلیت کے تفاوت کی وجہ سے تمام ملازم طبقوں کی تنخواہ یکساں نہیں اور نہ تمام تاجروں کی آمدنی برابر ہے اور نہ تمام ارباب صنعت و حرفت کی کمائی برابر ہے۔ کیونکہ فکر و عمل کی قوت برابر نہیں۔

اس لیے فطری تفاوت کے تمام ثمرات و نتائج کو اپنی اصلی فطری حالت کے مطابق قائم رکھنا معقول ہے اور اس فطری تفاوتِ مال کے خلاف جدوجہد درحقیقت فطرت کے خلاف جنگ ہے۔ جس کو کسی طرح معقول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے اسلام نے اس فطری تفاوت کو برقرار رکھا اور امراء و غرباء کے دونوں طبقوں کا وجود تسلیم کیا اور امراء کے طبقہ پر ایسی پابندی عائد کی کہ غریب طبقے کے حقوق بھی محفوظ رہیں اور امراء اپنے فطری حدود سے تجاوز نہ کرنے پائیں۔ یہ پہلی اعتدالیت ہے جس کا درس ابوذر غفاری عوام کو دیتے رہے۔

امراء پر اسلام نے حسب ذیل پابندیاں لگائیں تاکہ اعتدال پیدا ہو کر غریب طبقے کے حقوق محفوظ ہو جائیں۔

- امیر طبقہ حدود فطرت و شریعت سے تجاوز کر کے سود کے ذریعہ مال میں اضافہ نہ کرے۔ بلکہ اس کے برخلاف غریب طبقہ کی قرض حسنہ کے طور پر امداد کرے۔

○ رشوت، ظلم اور دیگر ناجائز ذرائع سے مال نہ کمائے۔
سرمایہ دار طبقہ وسائل رزق پر صرف دولت کے اثر سے اپنا قبضہ جما کر غیر سرمایہ دار طبقے کو محروم نہ کرے تاکہ ان وسائل سے غیر سرمایہ دار طبقہ بھی مستفید ہو سکے اور فطری تفاوت اپنے حدود میں رہے تاکہ وہ قارونیت کی شکل اختیار نہ کر سکے۔ ورنہ بجائے فطری تفاوت کے قارونی تفاوت رونما ہوگا اور تمام وہ مفاسد اور خرابیاں رونما ہونگی جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہیں۔

○ امراء کے اموال میں فقراء طبقے کے جو حقوق ہیں، اسلام نے قانون زکوٰۃ و عشر و خراج و دیگر صدقات کے ذریعہ امراء کو فقراء کی حاجت روائی کے لیے جواب دہ قرار دیا تاکہ ہر سال امراء کے مال میں سے مناسب حصہ فقراء کو منتقل ہو کر فطری تفاوت اپنی حد کے اندر رہے اور بڑھنے نہ پائے۔

اکتنازی اور سرمایہ دارانہ نظام میں سب سے بڑی خرابی سودی کاروبار ہے۔ اسلام نے ہر قسم کے سود کو مفرد ہو یا مرکب حرام قرار دیا اور صرف اصل قرضے کی وصولی کی اجازت دی۔ ارشاد ہے:

وان تبتم فلکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون۔

"اگر تم سود سے توبہ کر دگے تو تم کو صرف اصل قرضہ ملے گا۔ نہ تم ظلم کرنے کے مجاز ہو کہ اصل قرضہ سے ایک کوڑی زائد لو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا کہ اصل قرضہ سے ایک کوڑی کم ملے۔"

اسی طرح سورہ بقرہ پ۳ ع ۶ میں ہے:

یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وذروا مابقی من الربوٰ ان کنتم مؤمنین۔

"اے ایماندارو! اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود، اگر تم کو اللہ کے فرمانے پر یقین ہے۔"

اسی طرح ——

احل اللہ البیع وحرم الربٰوا

"حلال کیا خدا نے تجارت کو اور حرام کیا سُود کو۔"

ان تینوں آیات میں اللہ نے سرمایہ داری کے بنیادی نقص کو دُور کیا اور سود کی تمام قسموں کو حرام ٹھہرایا خواہ اضعافا مضاعفہ ہو یا کم، چاہے ایک آنہ فیصد ہو۔

عرب میں دوہرے سود کا بھی رواج تھا جو سود کی بدترین شکل تھی کہ جب بھی میعاد پر قرضہ ادا نہ ہوتا تھا تو میعاد کے بڑھانے کے ساتھ ساتھ سود کی مقدار بھی بڑھاتے تھے۔ یہاں تک کہ سود کی رقم دوگنی سہ گنی ہو جاتی۔ اس کو بھی قرآن نے بخصوصی طور پر حرام کیا۔

الغرض قرآن نے سود کی تمام اقسام کے دروازے بند کر دیئے اور سود خور کو ایسی شدید دھمکی دی کہ قرآن میں کسی اور جرم پر ایسی دھمکی نہیں دی گئی۔

فرمایا:۔

فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ۔

"اگر سود نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کیلئے۔"

وان تبتم فلکم رؤس اموالکم۔

"اگر سود سے توبہ کرو تو صرف قرض لینا ہوگا نہ اس سے زیادہ چاہے ایک پائی ہو۔"

قرآن نے عمومی سود کو بھی حرام کیا اور ایک مخصوص صورت کو بھی جو قبیح تر تھی۔ اس کی حرمت بھی —— خصوصیت کے ساتھ ممنوع قرار دیا گیا۔ حرمت اشیا میں اسلامی ضابطہ یہ ہے کہ اس میں قلیل و کثیر کے لحاظ سے تفاوت نہیں ہوتا کہ کثیر سود حرام ہو اور قلیل جائز ہو۔ چوری قلیل و کثیر دونوں حرام ہیں۔ مردار کھانا قلیل و کثیر دونوں ناجائز ہیں۔ لہٰذا سود میں یہ حد بندی کہ سود مفرد حلال ہو اور سود مرکب حرام ہو، عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔

الغرض جو چیز مدار حکم ہو خواہ وہ کم ہو یا زیادہ اس سے حکم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔

مثلاً چوری حرام ہے اور حرمت کا مدار اس کا چوری ہونا ہے۔ اب چوری تھوڑی ہو یا زیادہ دونوں صورتوں میں حرام ہے۔ اس میں کم و بیش اور قلیل و کثیر کا حکم ایک ہی ہوگا کہ سب صورتیں حرام ہوں گی۔

سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کرتے ہوئے ابوذر غفاری یہ کہتے تھے کہ اس میں خامی و کجی یہ ہے کہ اس میں دولت ایک خاص طبقہ میں ساکن ہو کر رہ جاتی ہے اور دوسرے لوگوں تک حرکت نہیں کرتی۔ جس سے دوسرے لوگوں میں غربت و فلاکت رونما ہوتی ہے اور انسان کے اجتماعی جسم کا ایک بڑا حصہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔

ابن حزم المحلی میں لکھتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ نے اغنیا پر ضروریاتِ فقرا کو فرض قرار دیا ہے۔ اگر فقرا بھوکے اور ننگے ہوں اور اغنیا کے بند دینے کی وجہ سے تکلیف میں پڑ جائیں تو اللہ تعالیٰ ان سے حساب لے گا اور سزا دے گا۔ ضرورت کے وقت اغنیاء سے مال لے کر سب پر برابر تقسیم کیا جائے گا۔

ابو عبیدہ بن الجراح اور تین سو صحابہؓ نے توشہ جمع کر کے سب پر برابر تقسیم کیا۔ جن کو دو توشہ دانوں میں جمع کر کے برابر بقدر قوت سب کو دیتے رہے۔

ابو عبیدہ کے ہمراہ تین سو صحابہ تھے جن میں اکثر کے پاس توشہ یعنی زادِ راہ ختم ہو چکا تھا۔ آپ نے جن کے پاس زادِ راہ تھا ان سے لیکر سب پر برابر تقسیم کیا اور صحابہ میں سے کسی نے اسکے فعل پر اعتراض نہیں کیا۔ ابو عبیدہؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور لسانِ رسالت سے آپکو "امینِ ملت" کا خطاب ملا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جس کے پاس ضرورت سے زائد سواری ہو، وہ اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں اور جس کے پاس زادِ راہ زائد موجود ہو، وہ اس کو دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہیں ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسی کئی ضرورت کی چیزیں ذکر فرمائیں یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ ہمارے پاس ضرورت سے جو چیز زائد موجود ہو اس میں ہمارا کوئی حق نہیں۔

مادی اشتراکیت کے ساتھ ساتھ اسلام ایک معنوی اشتراکیت بھی لایا جو مادی اشتراکیت سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ اسلام کی مادی اشتراکیت کا مقصد مسلمانوں کے درمیان مالی امتیازات کو مٹانا تھا۔ رہی اسلام کی معنوی اشتراکیت، وہ یہ تھی کہ اسلام نے اجتماعی تفرقہ بازی مٹا دی۔

اسلام نے نماز فرض کی کہ تمام مسلمان امیر، غریب اور حاکم و محکوم برابر کھڑے ہو گئے کہ ایک ساتھ قیام اور رکوع و سجود کرتے ہیں۔ اسلام نے انہیں بتا دیا کہ سب برابر ہیں نیز جماعت لازم کی۔ امیر و غریب اور حاکم و محکوم ایک مقام پر جمع ہو گئے کہ فقیر امیر کے برابر کھڑا ہوتا ہے۔ بلکہ فقیر کبھی امیر سے آگے بڑھتا ہے اور پہلی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ امیر پچھلی صفوں میں کھڑا ہوتا ہے۔ اس عمل سے ان کے دل متحد و متفق ہو گئے اور اجتماعی امتیازات باطل ہو گئے۔ اسلام نے انہیں بتا دیا کہ اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں۔

اسلام نے روزہ فرض کیا۔ تمام مسلمان روزہ رکھتے ہیں خواہ امیر ہو یا فقیر، حاکم ہو یا محکوم۔ لہٰذا امیر بھی بھوکے رہے جس طرح کہ فقیر بھوکے رہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ امیروں کے دل غریبوں کے لیے پگھل گئے۔ انہوں نے صدقات دیئے۔ اس خیرات کی وجہ سے اجتماعی امتیازات دُور ہو گئے۔

اسلام نے حج فرض کیا اور سلے ہوئے کپڑے اُتار دینے کا حکم دیا۔ لہٰذا تمام مسلمانوں نے کپڑے اُتار کر احرام باندھا۔ خواہ امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم سب نے احرام کے کپڑے پہن لئے لہٰذا تفرقے مٹ گئے اور سب کے سب برابر حاجی بن گئے۔ نہ ان میں کوئی امتیاز تھا نہ ایک دُوسرے پر فضیلت۔

زکوٰۃ اسلام میں مادی اشتراکیت کا سبب بنی اور نماز، روزہ، حج اسلام کی معنوی اشتراکیت کا سبب بنی۔

المراجع

الموطا	مالک بن انس
سنن النسائی	ابو عبدالرحمان احمد بن شعیب النسائی
سنن ابو داؤد	ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی
احکام القرآن	ابو بکر الجصاص
اسد الغابہ	ابن الاثیر
الاستیعاب	حافظ ابو عمر بن عبدالبرّ
الامامۃ والسیاسۃ	ابن قُتیبہ
البدایہ والنّہایہ	ابن کثیر
السیرۃ النبویہ	ابن ہشام
السنن الکبریٰ	بیہقی
الکشّاف	زمخشری
الکامل فی التاریخ	ابن الاثیر
تاریخ الامم والملوک	الطبری
تذکرۃ الحفاظ	الذھبی
تفہیمات	ابوالاعلیٰ مودودی
تکملہ (تاریخ)	ابن خلدون
تہذیب التہذیب	ابن حجر

کتاب	مصنف
جامع البیان فی تفسیر القرآن	ابن جریر الطبری
حسن المحاضرہ	السیوطی
رُوح المعانی	علامہ آلوسی
شرح السیّر الکبیر	السّرخسی
شرح نہج البلاغہ	ابن ابی الحدید
صحیح بخاری	امام بخاری
صحیح مسلم	امام مسلم
طبقات ابن سعد	ابن سعد
کتاب الاُمّ	امام شافعی
کتاب السلوک	المقریزی
کنز العمّال	علی المتقی
مسند احمد بن حنبل	احمد بن حنبل
معجم البلدان	یاقوت حموی
مفاتیح الغیب	الرازی
منہاج السُنّۃ	ابن تیمیہ
وفیات الاعیان	ابن خلکان
حجۃ اللہ البالغہ	شاہ ولی اللہ
احیاء العلوم	امام غزالی
لسان العرب	ابن منظور
سیرۃ النبی	سید سلیمان ندوی
اسلامی ریاست	مولانا امین احسن اصلاحی
مواہب لدنیہ	احمد بن محمد قسطلانی
المغازی	الواقدی

کتاب	مصنف
تاریخ الاسلام ودول الاسلام	الذہبی
طبقات الامم	احمد قاضی طلیطلہ
الاعلام	خیر الدین زرکلی
اصابہ	علامہ ابن حجر
مفتاح الغیب	علامہ فخر الدین رازی
تاریخ الکبیر	ابن عساکر
سنن ابن ماجہ	القزوینی
جامع ترمذی	امام ترمذی
سنن دارقطنی	دارقطنی
سیرۃ النبی	مولانا شبلی نعمانی و سلیمان ندوی
ترجمان القرآن	مولانا ابوالکلام آزاد
رسولِ رحمت	مولانا ابوالکلام آزاد و مولانا غلام رسول مہر
دیارِ حبیب	مولانا فضلِ حق
محمد سید لولاک	آغا اشرف

سیرت
حضرت ابوذر غفاری
(رضی اللہ عنہ)
اسلامی مساوات کے عظیم علمبردار
صحابی رسول کے حالات و خیالات
مؤلفہ
آغا اشرف